ڈاکٹر محمد فاروق خان

امریکہ کا کردار

امت مسلمہ اور پاکستان کے تناظر میں

(۱)

موضوع کی ضرورت و اہمیت

امت مسلمہ اور پاکستان کے تناظر میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا مطالعہ ہمارے لیے حد درجہ اہمیت کا حامل ہے۔ یہ وسیع و عریض ملک، جس میں بیک وقت چار مختلف ٹائم زون ہیں، آج دنیا کا سب سے ترقی یافتہ، دولت منداور طاقت ور ملک ہے۔ یہ حیثیت اسے کئی دہائیوں سے حاصل ہے۔تاہم سوویت روس کے حصے بخرے ہونے کے بعد تو اس کا کوئی ظاہری حریف بھی نہیں رہا۔دنیا کے چھ بڑے ممالک یعنی برطانیہ،فرانس، جرمنی، جاپان، روس اور چین کی مجموعی طاقت بھی اس سے کم ہے۔دنیا بھر کی تجارت میں اس کا بہت بڑا حصہ ہے۔سائنس اور ٹیکنالوجی میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔صنعت و حرفت میں یہ سب سے آگے ہے۔اسلحہ سازی میں کوئی دوسرا ملک اس کا پاسنگ بھی نہیں۔دنیا بھر کے ہر معاملے میں وہ سرگرمی کے ساتھ دلچسپی لیتا ہے۔اقوام متحدہ کے اندر اس کا موقف سب سے زیادہ وزن رکھتا ہے، چنانچہ ہم ہی پر کیا موقوف، ہر ملک کے لیے امریکہ سے تعلق اہم ترین ایشوز میں سے ایک بن گیا ہے۔

امریکی موقف، اقدام اور کردار کو سمجھنے، اس کا تجزیہ کرنے اور اس کے مطابق اپنی حکمت عملی بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہمیں امریکہ سے بھرپور واقفیت ہو۔اس کی تاریخ، اس کے جمہوری نظام، اس کی اقدار، اس کے کلچر، اس کے طرز زندگی، اس کے اداروں اور اس کی سوچ کے مختلف زاویوں پر ہماری پوری گرفت ہو۔ان تمام چیزوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جب ہم کوئی حکمت عملی بنائیں گے تو وہ ہمارے مفادات اور امن عالم کے لیے بہتر ہو گی۔

اس وقت عالم اسلام میں امریکہ کے متعلق تین رویے ہیں۔ایک یہ کہ امریکہ مجموعۂ شر اور شیطان کبیر ہے۔وہ مسلمانوں کا دشمن ہے اور انھیں نیست و نابود کرنا چاہتا ہے۔وہ مسلمانوں کو معاشی اور سیاسی طور پر ہمیشہ کمزور، دست نگر اور اپنی گرفت میں دیکھنا چاہتا ہے۔وہ ہر حال میں مسلمانوں کی ترقی و خوش حالی کا مخالف ہے اور اس مقصد کے لیے امریکہ، یورپ اور اسرائیل کا گٹھ جوڑ

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

مسلسل مصروف عمل ہے۔ مسلمانوں کی تمام خرابیوں اور کمزوریوں کی جڑ امریکہ ہے۔ پاکستان میں اور مسلم دنیا کے کسی ملک میں امریکہ کے اشارۂ ابرو کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ ہر حکمران کا نصب وعزل امریکہ ہی کا مرہون منت ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر دو مسلمان گروہ یا ملک آپس میں لڑتے ہیں تو یہ بھی دراصل امریکی سازش کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس لیے امریکہ جو کچھ بھی کرتا ہے، وہ لازماً خلاف اسلام اور خلاف مسلم ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم ہر امریکی اقدام کی مخالفت کریں۔ امریکہ کے خلاف مسلمان رائے عامہ کو بیدار کریں اور بیدار رکھیں۔ ہماری سیاست اور ہماری سوچ کا مرکز ومحور امریکہ دشمنی ہونا چاہیے۔

اس کے بالکل برعکس دوسرا رویہ یہ ہے کہ امریکہ ایک سپر طاقت ہے جس کے بغیر اس دنیا میں کوئی طاقت ور بھی دم نہیں مار سکتا۔ امریکہ کی مخالفت کرنا اپنی موت کو دعوت دینا ہے۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ امریکہ کا حامی اور دوست بن کر جیا جائے۔ اس کے حضور میں اپنی عرض داشت تو پہنچائی جائے، تاہم عملاً راضی برضاے امریکہ کا انداز اختیار کیا جائے۔ ایسا کوئی کام نہ کیا جائے جس سے امریکہ ناراض ہو۔ ہم امریکہ کی ناراضی پر قادر نہیں۔ اگر وہ ہم سے ناخوش ہوا تو وہ ہمارے لیے معاشی اور سیاسی پریشانیاں پیدا کر دے گا۔ عوام ہماری حکومتوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ یوں ہمارا تختہ الٹ جائے گا۔

تیسرا رویہ یہ ہے کہ امریکی فیکٹر کو ایک حد سے زیادہ اہمیت نہ دی جائے، بلکہ اصل توجہ اپنے ملک اور گھر کی حالت سدھارنے پر رکھی جائے۔ اگر ہمارے عوام مطمئن ہوں گے، سیاسی آزادی ہوگی، معاشی ترقی ہوگی اور ملک ٹیکنالوجی میں آگے بڑھتا جائے گا تو مفروضہ یا حقیقی، کوئی بیرونی سازش کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ امریکہ ایک حد سے زیادہ ہمارے معاملات میں دخیل ہی نہ ہو سکے گا۔ دراصل یہ ہم ہیں جن کی اپنی کمزوریوں اور غلطیوں سے امریکہ فائدہ اٹھا کر دخل اندازی کے مواقع تلاش کر لیتا ہے۔ اس لیے امریکہ کو ایسا کوئی موقع دیا ہی نہیں جانا چاہیے۔ بین الاقوامی امور میں امریکہ سے تعلقات کار بھی رکھے جائیں اور اس سے ایک باوقار فاصلہ بھی رکھا جائے۔ کسی بھی معاملے میں بلاضرورت نہ امریکہ کی مخالفت کی جائے نہ حمایت، بلکہ ہر مسئلے کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا جائزہ لے کر اصولی اور عملی، دونوں امور کو سامنے رکھ کر حکمت عملی بنائی جائے۔ مسلم دنیا میں فی الوقت صرف ملائیشیا کسی حد تک اس رویے پر گامزن ہے۔

پاکستان کا ہر آدمی سیاست سے گہری دلچسپی رکھتا ہے۔ بازاروں، حجروں، بیٹھکوں، ڈرائینگ روموں غرض یہ کہ ہر محفل کا مرغوب ترین موضوع سیاسی گفتگو ہوتا ہے۔ ہر سیاسی گفتگو کی تان امریکہ پر آ کر ٹوٹتی ہے۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ امریکی نظام اور امریکی اقدار سے متعلق ہمیں پوری آگاہی ہو تا کہ ہماری سوچ میں معروضیت پیدا ہو سکے۔

بنیادی حقائق اور مختصر تاریخ

ریاست ہاے متحدہ امریکہ کا رقبہ تقریباً چورانوے لاکھ مربع کلومیٹر ہے۔ گویا رقبے کے لحاظ سے یہ پاکستان سے تقریباً ۱۲ گنا بڑا ہے۔ فی کس آمدنی تقریباً ۴۰ ہزار ڈالر سالانہ ہے۔ یہ پچاس ریاستوں اور ایک وفاقی ضلع پر مشتمل ہے۔ اس کی

آبادی تقریباً ۲۷ کروڑ ہے۔ اس کے ایک طرف بحر اوقیانوس اور دوسری طرف بحر الکاہل ہے۔ جبکہ شمال میں اسی کا ایک دوست ملک کینیڈا اور جنوب میں دونوں سمندروں کے علاوہ ایک غریب ملک میکسیکو ہے جس کا ہر باشندہ امریکہ جانے کے لیے تڑپتا رہتا ہے۔ گویا امریکہ پر فوجی حملہ ناممکن حد تک مشکل ہے۔

امریکہ کی تاریخ پوری دنیا میں نرالی ہے۔ یہ درحقیقت ایک نیا ملک ہے جو آج سے پانچ سو سال قبل دریافت ہوا جہاں سترہویں صدی میں یورپ سے آبادکاروں کی آمد شروع ہوئی اور اسی کے ساتھ افریقی غلاموں کو لانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ویسے تو ۱۴۹۷ء ہی میں سلطنت برطانیہ نے شمالی امریکہ کو اپنا علاقہ قرار دے دیا تھا، تاہم یہاں انگریزوں کی آمد تقریباً ایک صدی بعد شروع ہوئی۔ قدرتی وسائل سے مالا مال اور وسیع وعریض زمین کے حامل ملک نے بے شمار لوگوں کو قسمت آزمائی کے لیے مہم جوئی پر آمادہ کر لیا۔ بہت سے لوگوں نے مذہبی عدم رواداری اور آبادی کے پھیلاؤ کی وجہ سے بھی ترک وطن کر لیا۔ چونکہ یہ سب لوگ ایک ترقی یافتہ ملک سے آئے تھے، اس لیے معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ سیاسی ادارے بھی وجود میں آنے لگے۔ اگرچہ بظاہر حکومت تاج برطانیہ کی تھی، لیکن اصل اختیار منتخب اسمبلیوں کے پاس تھا۔ چونکہ یہاں ہر مذہب اور علاقوں کے لوگ آئے تھے اور ان کو مختلف کالونیوں میں اکٹھے رہنا تھا، اس لیے پہلے دن ہی سے بہت متنوع مذہبی اور تہذیبی زندگی وجود میں آ گئی۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۱۷۶۰ء میں سلطنت برطانیہ نے اس علاقے پر اپنا کنٹرول مضبوط کرنے کے لیے مختلف ٹیکس لگانے شروع کیے اور مزید حکام اور افواج کو یہاں بھیجنا شروع کیا۔ اس کے خلاف امریکی عوام میں غم وغصہ کے جذبات پیدا ہوئے۔ کئی ریاستوں کی اسمبلیوں نے ان ٹیکسوں کو خلاف قانون قرار دیا اور عوامی سطح پر بھی احتجاج شروع ہوا۔

۱۷۷۳ء میں چائے کے ٹیکس پر نظر ثانی کی گئی اور یہ سارا کاروبار ایسٹ انڈیا کمپنی کو سونپ دیا گیا۔ اس پر بڑا سخت احتجاج ہوا اور دسمبر ۱۷۷۳ء میں امریکی مزدوروں، جو ریڈ انڈینز کا لباس پہنے ہوئے تھے، نے چائے کی پتی کی ۳۴۲ پیٹیوں کو بوسٹن کے مقام پر سمندر میں پھینک دیا۔ اس مشہور واقعے کو بوسٹن ٹی پارٹی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اپریل ۱۷۷۵ میں تیرہ ریاستوں نے الحاق کر لیا اور جارج واشنگٹن کو امریکی فوج کا کمانڈر مقرر کر دیا گیا۔ یوں اس نوزائیدہ ریاست اور برطانیہ کی آپس میں لڑائی شروع ہو گئی۔ ۴ جولائی ۱۷۷۶ کو باقاعدہ اعلان آزادی کیا گیا۔ یہ جنگ آزادی اگلے پانچ برس تک جاری رہی اور اس میں فرانس نے بھی برطانیہ کے خلاف امریکی افواج کا بھرپور ساتھ دیا۔ اس جنگ میں دونوں طرف سے ہزاروں لوگ ہلاک ہوئے۔ اس پورے وقت میں اور اس کے بعد بھی سارے ملک میں نظام حکومت کے متعلق مسلسل بحث جاری رہی۔ پہلے دن ہی سے تمام قائدین اور سب لوگوں کے دل میں یہ بات جاگزیں ہو گئی کہ ان کی بقا اور ترقی کی واحد ضمانت جمہوریت میں پوشیدہ ہے۔ چنانچہ بالکل ابتدا ہی سے جمہوری کلچر اس نئی مملکت کے اندر بنیادی قدر کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اس وفاق میں آہستہ آہستہ مزید ریاستیں بھی داخل ہوتی رہیں۔

اس دوران میں شمالی اور جنوبی ریاستوں کے درمیان آویزش بڑھتی رہی۔ اس آویزش کی اہم وجہ ''مسئلۂ غلامی'' تھا۔ مارچ ۱۸۶۱ میں لنکن کے عہدۂ صدارت سنبھالنے کے وقت جنوب کی ساری ریاستوں نے وفاق چھوڑنے کا اعلان کیا۔ اپریل ۱۸۶۱ میں شمالی اور جنوبی ریاستوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ یہ لڑائی اگلے چار برس تک جاری رہی جس میں شمال کو فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی اور جنوب کی ساری ریاستیں ایک دفعہ پھر وفاق کا حصہ بن گئیں۔ اس جنگ میں بھی دونوں طرف سے ہزاروں لوگ ہلاک ہوئے۔ اس خونی جنگ کے خاتمہ کے بعد ملکی تعمیر نو کا کام جوش و جذبے سے شروع ہوا۔ غلامی کو ممنوع قرار دیا گیا۔ اس دوران میں بہت بڑی تعداد میں تارکین وطن امریکہ آکر آباد ہوئے۔ جس کی وجہ سے آبادی بھی بہت بڑھ گئی اور ان لوگوں نے امریکی صنعت و حرفت کو آگے بڑھانے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ ۱۸۹۸ء میں کیوبا کے مسئلے پر امریکہ اور اسپین کے درمیان لڑائی چھڑ گئی جس میں امریکہ فاتح رہا۔ پہلی جنگ عظیم کے موقع پر پہلے چار سال کے دوران میں امریکہ غیر جانب دار رہا، اگرچہ اس کی ہمدردیاں مغربی طاقتوں کے ساتھ تھیں۔ اس دوران میں جرمنی نے، اس شک کی بنیاد پر کہ امریکی جہازوں میں اتحادیوں کے لیے اسلحہ لے جایا جاتا ہے، کئی امریکی بحری جہازوں کو ڈبو دیا۔ اس پر امریکہ نے بھی اتحادیوں کا ساتھ دینے کا اعلان کیا۔ یوں آخری سال میں جرمنی کی شکست میں امریکہ نے بھی اپنا کردار ادا کیا۔ اس جنگ کے بعد امریکہ نے پہلی بین الاقوامی باڈی یعنی لیگ آف نیشنز میں سب سے سرگرم کردار ادا کیا۔

۱۹۲۹ء سے لے کر ۱۹۳۳ء یعنی چار سال ملک سخت مالی بحران کی لپیٹ میں رہا۔ اس کو ''گریٹ ڈیپریشن'' کے سال کہا جاتا ہے۔ تاہم سخت قانونی اور مالی اقدامات کی وجہ سے روزویلٹ نے اس بحران پر قابو پالیا۔

۷ ستمبر ۱۹۴۱ کو جاپان نے پرل ہاربر نامی امریکی بندرگاہ پر زبردست حملہ کیا جس کے نتیجے میں امریکہ نے پہلے جاپان اور پھر جرمنی اور اٹلی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ۱۹۴۵ میں امریکہ ایٹم بم بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ ۶ اگست کو صدر ٹرومین کے حکم سے ہیروشیما کے شہر پر پہلا ایٹم بم گرایا گیا جس سے اسی ہزار آدمی موت کے گھاٹ اتر گئے اور تقریباً ایک لاکھ شدید زخمی ہوئے۔ اس کے تین دن بعد ناگاساکی کو ایٹم بم کا نشانہ بنایا گیا۔ اس کے پانچ دن بعد جاپان نے ہتھیار ڈال دیے۔

جنگ عظیم دوم کے فوراً بعد امریکہ اور روس کے درمیان سرد جنگ شروع ہو گئی، اس لیے کہ روس نے اپنا دائرۂ اثر مشرقی یورپ اور ایشیا کے بہت سے ممالک تک پھیلا لیا۔ چنانچہ امریکہ نے اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے کئی ممالک سے فوجی معاہدے کیے جس میں (NATO-North Atlantic Treaty Organization) بھی شامل تھا۔

۱۹۵۰ء میں جنوبی کوریا کو شمالی کوریا کے حملے کے خلاف مدافعت کے لیے امریکہ نے جنرل میک آرتھر کی قیادت میں فوج بھیجی۔ اس فوج نے شمالی کوریا کو تقریباً فتح کر لیا، مگر جب یہ فوج دریائے یالو کے قریب پہنچی جو شمالی کوریا اور چین کی سرحد پر واقع ہے، تو دس لاکھ چینی فوج نے اس پر حملہ کر کے اسے تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ جنرل میک آرتھر نے کانگریس کے ارکان کو خط لکھا جس میں اس نے چین پر بمباری اور حملہ کرنے کی اجازت نہ دینے پر صدر ٹرومین کی مذمت کی۔ اس پر ٹرومین

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نے اسے کمانڈ سے علیحدہ کر دیا۔اس کے بعد کچھ برس تک امریکہ نے خارجہ تعلقات میں احتیاط کی پالیسی اپنائی۔مثلاً ۱۹۵۴ء میں جب انڈوچائنا میں کمیونزم کی حامی قوم پرست قوتیں فرانس کے خلاف لڑ رہی تھیں تو امریکہ نے فرانس کی مدد نہیں کی۔ ۱۹۵۶ء میں ہنگری میں کمیونسٹ تسلط کے خلاف بغاوت پھوٹ پڑی، مگر امریکہ نے باغیوں کی کوئی مدد نہیں کی۔اسی طرح جب برطانیہ،فرانس اور اسرئیل نے نہر سویز پر قبضہ کر لیا تو امریکہ نے ان تینوں ممالک سے یہ قبضہ چھڑانے کے لیے ان کو معاشی مقاطعے کی دھمکی تو دی،لیکن روس کے مقابلے میں براہ راست آنے سے کتراتا رہا، تاہم روس کے مقابلے کے لیے اس نے کئی دفاعی معاہدے کیے جن میں سیٹو (Southeast Asia Treaty Organization) اور سینٹو (Central Middle Eastern Treaty Organisation) بہت اہم ہیں۔

اگست ۱۹۶۴ میں،جبکہ کمیونسٹ شمالی ویت نام نے جنوبی ویت نام پر حملہ کر کے اسے کافی حد تک مغلوب کر لیا تھا،صدر جانسن نے اس جنگ میں کود پڑنے اور جنوبی ویت نام کو کمیونسٹ غلبے سے بچانے کا اعلان کیا۔وہاں امریکہ نے تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ فوجی بھیجے۔اگلے نو برس تک امریکی فوجی ویت نام کی لڑائی میں شریک رہے۔اس جنگ میں تقریباً اڑسٹھ ہزار امریکی فوجی مارے گئے۔ایک بڑی تعداد شدید زخمی ہوئی۔تقریباً دس ہزار امریکی طیارے تباہ ہوئے اور امریکی معیشت کو بھی اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔بالآخر صدر نکسن نے امریکہ کو اس ہاری ہوئی جنگ سے نکالا۔

صدر کارٹر کے وقت میں بھی امریکہ کو ایک زک پہنچی جب ۱۹۷۹ء میں امریکی اتحادی شہنشاہ ایران کو ایک عوامی بغاوت، جس کی قیادت مذہبی طبقہ کر رہا تھا، کے ذریعے سے تخت سے اتار دیا گیا۔تین نومبر ۱۹۷۹ء کو تہران میں امریکی سفارت کاروں کو یرغمال بنالیا گیا۔ان سفارت کاروں کو رہا کرانے کے لیے کارٹر کی تمام کوششیں بشمول ملٹری ایکشن ناکام رہیں۔ بالآخر سوا سال بعد ۲۰ جنوری ۱۹۸۱ کو صدر ریگن کی حلف برداری کے دن ایران نے ان یرغمالیوں کو رہا کر دیا۔

اپریل ۱۹۷۸ میں افغانستان میں نور محمد ترکئی کی قیادت میں صدر سردار داؤد کا تختہ الٹ کر کمیونسٹ انقلاب برپا کر دیا گیا۔ اس پر افغانستان میں خانہ جنگی چھڑ گئی اور کمیونزم مخالف اسلامی عناصر نے دیہی علاقے کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔۲۵ دسمبر ۱۹۷۹ کو روسی افواج افغانستان میں داخل ہوئیں۔اس پر امریکہ نے روس مخالف اسلامی عناصر کو اسلحہ،رقم اور سامان رسد کی فراہمی شروع کر دی۔اگلے آٹھ نو برس میں امریکہ نے ان عناصر کو دو ارب ڈالر کا اسلحہ دیا۔اتنی ہی مدد سعودی عرب نے بھی فراہم کی۔چین،ایران اور مصر نے بھی روس مخالف افواج کی پوری پوری مدد کی۔ستمبر ۱۹۸۶ میں امریکہ نے مجاہدین کو اینٹی ائیر کرافٹ اسٹنگر میزائل دینے شروع کیے۔ان میزائلوں نے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔سیکڑوں روسی طیارے گرنے سے اس کی کمر ٹوٹ گئی۔اس جنگ میں پینتیس ہزار کے لگ بھگ روسی ہلاک ہوئے۔بالآخر روسی افواج کو افغانستان سے نکلنا پڑا اور فروری ۱۹۸۹ تک تمام روسی افغانستان سے واپس چلے گئے۔اس جنگ سے روس کو معاشی طور پر اتنا نقصان ہوا جس سے وہ سنبھل نہ سکا۔یہ امریکہ کی ایک بڑی کامیابی تھی۔اس لیے کہ اپنا ایک بھی سپاہی مروائے بغیر اس نے روس کو عبرت ناک

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

شکست دے دی۔

۲ اگست ۱۹۹۰ کو عراق نے کویت پر فوجی قبضہ کر لیا۔ اقوام متحدہ نے فوری طور پر اس کی مذمت کی۔ امریکہ کی سربراہی میں ۲۸ ملکوں پر مشتمل فوج بنائی گئی۔ عراق کو الٹی میٹم دیا گیا کہ وہ کویت پر قبضہ چھوڑ دے ورنہ ۱۶ جنوری ۱۹۹۱ کے بعد اس کے خلاف فوجی ایکشن کیا جائے گا۔

عراق کی طرف سے انکار پر اس کے خلاف بمباری شروع کی گئی۔ پانچ ہفتے کی بمباری کے بعد زمینی حملہ کر دیا گیا۔ یہ حملہ چار دن جاری رہا۔ عراق کی فوج افراتفری کے عالم میں کویت سے واپس ہوئی حتیٰ کہ انھوں نے جنوبی عراق بھی خالی کر دیا۔ اس جنگ میں تقریباً دو لاکھ عراقی فوجی اور سویلین کام آئے جب کہ امریکی افواج کا نقصان نہ ہونے کے برابر ہوا۔ صرف یہی نہیں، بلکہ کویت اور سعودی عرب کو مستقبل کے ممکنہ عراقی جارحیت سے روکنے کے لیے کچھ امریکی افواج سعودی عرب اور کویت میں ٹھہر گئیں۔ امریکی افواج کے تمام اخراجات بھی سعودی عرب اور کویت نے ادا کیے۔ اس سے پہلے عراق ستمبر ۱۹۸۰ میں ایران پر حملہ آور ہوا تھا۔ یہ جنگ جو اگست ۱۹۸۸ تک یعنی آٹھ برس جاری رہی، اس میں بھی چار لاکھ عراقی اور چھ لاکھ ایرانی مارے گئے تھے۔ جبکہ ان دونوں ممالک اور باقی عرب ممالک کے بیسیوں ارب ڈالر اس بے قائدہ جنگ کی نذر ہوئے۔

دسمبر ۱۹۹۱ میں یوگوسلاویہ کا شیرازہ بکھرنے کے بعد مسلم اکثریتی صوبے بوسنیا نے آزادی کا اعلان کیا۔ اس پر ہمسایہ عیسائی ریاست سربیا نے بوسنیا پر حملہ کر دیا۔ بوسنیا میں بھی ۳۰ فی صد سرب باشندے رہایش پزیر تھے، اس لیے بوسنیا کو بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلے تین سال بوسنیا نے اپنا کامیاب دفاع کیا۔ پھر امریکہ کے دباؤ پر یورپی ممالک کی افواج نے نیٹو کی کمان کے تحت سربیا کی افواج اور بلغراد پر پانچ ہفتے تک فضائی حملے جاری رکھے۔ بالآخر سربیا مذاکرات پر آمادہ ہو گیا۔ امریکہ کے تحت مذاکرات ہوئے جس کے نتیجے میں ''ڈیٹن امن سمجھوتا'' طے پایا اور مسلم اکثریتی بوسنیا ایک آزاد ملک کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر جلوہ گر ہو گیا۔ بعد میں جنگی مجرموں کی حیثیت سے کئی سرب لیڈروں پر بین الاقوامی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اور انھیں سزائیں دی گئیں۔ بوسنیا کی حکومت کو امریکہ اور یورپی اقوام نے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لیے ۶ ارب ڈالر کی امداد بھی دی۔

بوسنیا کے بالکل قریب کوسووو کا ایک اور مسلم اکثریتی علاقہ موجود ہے۔ اس علاقے کو بھی عیسائی آرتھوڈوکس سربیا سے بچانے کے لیے امریکہ کے دباؤ پر نیٹو کی افواج نے سربیا افواج پر زبردست بم باری کی۔ اس کے نتیجے میں یورپ کے اندر ایک اور مسلم ملک منصۂ شہود میں آ گیا۔

۱۹۹۸ سے امریکہ اسامہ بن لادن کے معاملے میں الجھ گیا۔ بن لادن جو سعودی عرب کے انتہائی بااثر خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ۱۹۸۰ سے لے کر ۱۹۹۰ تک افغانستان میں تھے۔ خلیجی جنگ کے بعد جب سعودی عرب کی درخواست پر کچھ امریکی

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

افواج وہیں ٹھہر گئیں تب بن لادن سعودی حکمرانوں اور امریکہ، دونوں کے خلاف ہو گئے۔ ۱۹۹۲ کے بعد وہ چار سال سوڈان میں مقیم ہو کر اپنے ساتھیوں کی فوجی تربیت کرتے رہے۔ پھر وہ ۱۹۹۶ میں افغانستان چلے آئے۔ اگست ۱۹۹۶ میں انھوں نے امریکہ کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ ان کی زیر سرکردگی بہت سے کیمپ بنائے گئے جہاں سیکڑوں عربوں اور دوسری قومیتوں کے لوگوں کو مسلح تربیت دی جاتی تھی۔ ۲۳ فروری ۱۹۹۸ کو خوست کیمپ میں القاعدہ سے وابستہ تمام گروپوں نے ایک فتوے کے ذریعے سے امریکہ اور اس کے اتحادی ممالک کے خلاف باقاعدہ اعلان جنگ کیا اور کہا کہ ان ممالک کے ہر فوجی اور سویلین کو قتل کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ اگست ۱۹۹۸ میں کینیا اور تنزانیہ کے امریکی سفارت خانوں میں بم دھماکوں میں کئی سو افراد ہلاک ہوئے۔ امریکہ نے اس کا الزام القاعدہ پر لگایا اور افغانستان کی طالبان حکومت سے مطالبہ کیا کہ ملزموں کو اس کے حوالے کر دیا جائے۔ اقوام متحدہ کی طرف سے بھی اسی مضمون کا متفقہ مطالبہ کیا گیا۔ اس کے بعد یمن کی بندرگاہ پر کول نامی بحری جہاز پر حملے کو بھی القاعدہ کی کارروائی قرار دیا گیا۔ لیکن سب سے بڑا سانحہ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ کو پیش آیا۔ جب انیس عرب خودکش ہائی جیکروں نے چار ہوائی جہاز اغوا کر کے دو جہازوں کو امریکہ اور نیویارک کی مشہور ترین اور اہم ترین عمارت ورلڈ ٹریڈ سنٹر سے ٹکرا کر اس بلڈنگ کو زمین بوس کر دیا اور اس میں موجود چار ہزار افراد ہلاک ہو گئے۔ تیسرا جہاز امریکی افواج کے ہیڈ کوارٹر پینٹا گان سے جا ٹکرایا اور چوتھا جہاز اغوا ہونے کے بعد مسافروں اور ہائی جیکرز کے جھگڑے میں گر کر تباہ ہو گیا۔ اس حملہ کے ضمن میں ''اہم ترین مشتبہ'' القاعدہ اور بن لادن کو قرار دیا گیا۔ امریکہ نے بہت واضح الفاظ میں طالبان کو الٹی میٹم دیا کہ القاعدہ تنظیم کے اہم ارکان کو اس کے حوالے کر دیا جائے ورنہ وہ افغانستان پر حملہ کر دے گا۔ اقوام متحدہ نے بھی متفقہ قرارداد کے ذریعے سے یہی مطالبہ کیا۔ مگر طالبان نے اس مطالبہ کو پورا کرنے سے انکار کر دیا۔ جس کے نتیجے میں ۷ اکتوبر کو امریکہ نے شمالی اتحاد کی مدد سے طالبان کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ دو مہینے کے اندر اندر طالبان حکومت ختم ہو گئی اور ۲۰ دسمبر کو بون معاہدے کی رو سے حامد کرزئی عبوری حکومت کے سربراہ مقرر ہوئے۔ امریکہ اور اس کی اتحادی افواج اب بھی افغانستان میں مقیم ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

چند اہم معاشرتی پہلو

انفرادی آزادی

امریکی کلچر میں ذاتی پسند و ناپسند اور ذاتی کامیابی پر بہت غیر معمولی زور دیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ معاشرہ دنیا کے دوسرے معاشروں حتیٰ کہ یورپی معاشروں سے بھی بہت مختلف ہے۔ چونکہ ہر آدمی اپنی ذاتی حیثیت سے اس سرزمین پر آیا اور اس کے سامنے کام کرنے اور کامیابی حاصل کرنے کا ایک موقع تھا۔ یہاں آنے والوں کی بڑی اکثریت مڈل کلاس یا غریب طبقے سے تعلق رکھتی تھی، اس لیے اعلیٰ طبقے کا رکھ رکھاؤ اور اس کی مصنوعی اقدار یہاں منتقل نہیں ہوئیں۔ گویا پورا امریکہ درحقیقت تہذیبی اعتبار سے ایک مڈل کلاس سوسائٹی ہے جہاں کوئی بھی فرد اپنے آپ کو کسی بھی دوسرے فرد سے کم تر یا برتر نہیں سمجھتا۔ اسی

لیے امریکی جلد بے تکلف ہونے والے، صاف گو اور دوستانہ طبیعت کے لوگ ہیں۔ دوسری سوسائٹیوں کے برعکس امریکی کلچر میں خاندانی وجاہت اور وراثتی دولت کوئی ذریعۂ عزت وافتخار نہیں، بلکہ اصل کارنامہ وہی ہے جو اپنے زور بازو سے انجام دیا جائے۔

یہ قدر اتنی اہمیت رکھتی ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے فرد کی ذاتی زندگی میں دخل اندازی نہیں کرسکتا۔ اگر کوئی انسان قانون کی خلاف ورزی نہیں کرتا اور تشدد کی تبلیغ نہیں کرتا تو پھر وہ جو چاہے کرے اور جو چاہے کہے۔ اس انفرادیت کی وجہ سے مقابلے کا رجحان بھی بہت زیادہ ہے۔ ہر فرد کے لیے لازم ہے کہ وہ خود کچھ کر کے دکھائے۔ اسی قدر کی وجہ سے یہ معاشرہ قانونی تارکین وطن کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں۔

جمہوری اقدار

جمہوری کلچر اس معاشرے کے رگ و پے میں اسی طرح سرایت کیے ہوئے ہے کہ اس کے بغیر کوئی فرد اجتماعی زندگی کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ یہ سوسائٹی بتدریج بادشاہت سے جمہوریت کی طرف نہیں آئی، بلکہ انفرادی آزادی کی ایک شاخ کی حیثیت سے اس نے آنکھ ہی جمہوریت کے ماحول میں کھولی ہے۔ سب لوگ پہلے دن سے یہ جان گئے کہ جمہوریت کے بغیر وہ زندہ ہی نہیں رہ سکتے۔ اسی لیے ان کا ہر رہنما جمہوریت سے آخری درجے میں مخلص تھا۔ یہاں جمہوریت کا ہر ممکن تجربہ ہوا۔ یہاں کا پریس آزاد بھی ہے اور بے رحم بھی۔ یہاں ٹی وی چینلوں اور ریڈیو اسٹیشنوں پر حکومت کی اجارہ داری نہیں۔ بیشک کئی معاملات سے متعلق یہاں تعصب بھی برتا جاتا ہے اور جس معاملے پر اجماع ہو، وہاں مخالفین کی بات مشکل ہی سے سنی جاتی ہے، مگر سب کچھ جمہوری دائرے کے اندر ہوتا ہے۔ ہر فرد کی رائے کا احترام کیا جاتا ہے۔ سیاسی پارٹیوں کے اندر بھی کسی پارٹی لیڈر یا کسی سنٹرل ایگزیکٹیو کو ویٹو پاور حاصل نہیں ہوتا۔ گویا جس طرح ایک فرد کی زندگی انفرادی آزادی سے عبارت ہے، اسی طرح اجتماعی زندگی کی بنیادی قدر جمہوریت ہے۔

مذہبی لگاؤ

دوسرے ترقی یافتہ معاشروں کے برعکس امریکہ میں مذہب کی گرفت کافی حد تک مضبوط ہے۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد چرچ سے اپنا تعلق رکھتی ہے اور اپنے عیسائی ہونے کا شعور رکھتی ہے۔ مذہبی پروگراموں اور مذہبی رفاہی اداروں میں لوگ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ بے شمار لوگ مذہب کی ترویج اور خدمت کو اپنا بنیادی مقصد زندگی بنا لیتے ہیں اور اس کے لیے دنیا کے دور دراز دشوار گزار گوشوں میں کئی کئی سال تک خدمت انجام دیتے ہیں۔ گویا مذہب یہاں ایک زندہ قدر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے لوگ دوسرے مذاہب میں بھی دلچسپی لیتے ہیں اور اس ضمن میں تبادلۂ خیال کو پسند کیا جاتا ہے۔

اجتماعی اخلاقیات

امریکی معاشرے میں سچائی، امانت، دیانت اور انصاف کا عام چلن ہے۔ جھوٹ بولنے، غلط بیانی کرنے اور ملاوٹ کرنے کو بدترین برائیاں سمجھا جاتا ہے۔ ناپ تول میں کوئی بے ایمانی نہیں کی جاتی۔ قانون کی پابندی کو ہر انسان لازمۂ حیات

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تصور کرتا ہے۔ ہر انسان سچی گواہی دینے کے لیے ہر وقت آمادہ و تیار رہتا ہے۔ ہر جگہ محنت کی قدر ہے۔ ہر فرد کی اصل قیمت اس کی صلاحیت و قابلیت ہے۔ رشوت و ناجائز سفارش ناقابل تصور ہے۔ ہر بات دلیل کی بنیاد پر کہی اور سنی جاتی ہے، خود تنقیدی عام ہے۔ جذباتیت بہت کم ہے۔ برداشت اور مکالمہ کو بہت پسند کیا جاتا ہے۔

اس سوسائٹی میں ہر فرد کو یہ تربیت دی جاتی ہے کہ اسے اپنے وقت، صلاحیت اور سرمائے کا کچھ حصہ لازماً معاشرے کی خدمت میں صرف کرنا ہے۔ یہ خدمت ہمہ جہت اور نہایت متنوع ہوسکتی ہے۔ چنانچہ مفلوک الحال طبقات اور غریب مریضوں کے لیے بے شمار ادارے موجود ہیں۔ مستحق طلبہ کی مدد کے لیے بیسیوں ادارے ہیں۔ معاشرے میں کسی اچھی بات یا کسی قدر کو عام کرنے کے لیے کئی انجمنیں مصروف عمل ہیں۔ مثلاً ایسی تنظیمیں بھی موجود ہیں جو ایڈز سے بچاؤ کے لیے نوجوانوں میں یہ تحریک چلاتی ہیں کہ وہ شادی سے پہلے جنسی تعلق سے احتراز کریں۔ خاندانی نظام کی بحالی کے لیے کئی ادارے کام کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ جانوروں کے حقوق کے تحفظ، پرانے آرٹ و ادب کے تحفظ، غرض یہ کہ ہر قابل تصور موضوع کے لیے لوگوں نے اپنے آپ کو وقف کیا ہوا ہے۔ گویا ہر فرد اجتماعیت کی خدمت کے لیے کچھ نہ کچھ قربانی ضرور دیتا ہے۔ جنسی اعتبار سے امریکی سوسائٹی افراط و تفریط کا شکار ہے۔ تاہم بعض یورپی معاشروں کے برعکس یہ مادر پدر آزاد معاشرہ نہیں ہے۔ کم لباس، مخلوط محفلیں، کلب اور ڈانس روز مرہ کا معمول ہیں، تاہم فری سیکس بہت کم ہے اور اسے بری نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ راہ چلتے بوس و کنار کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ ایک طرف گرل فرینڈ اور بوائے فرینڈ کے رشتے کی میاں بیوی کے رشتے کی طرح حفاظت کی جاتی ہے، سوائے اس کے کہ میاں بیوی کا رشتہ قانونی اور دستاویزی ہوتا ہے، جب کہ دوسرے رشتے کے لیے کسی دستاویز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دوسری طرف سنگل مدرز یعنی اکیلی مائیں بھی عام ہیں۔ یہاں کسی سے جنسی تعلق بنانا آسان نہیں تو دوسری طرف ہم جنسیت پر بھی کوئی پابندی نہیں۔ البتہ یہ بات جان لینی چاہیے کہ دس فی صد سے کم لوگ اس میں آلودہ ہیں اور معاشرے کی ایک بڑی اکثریت اس سے نفرت کرتی ہے۔ گویا جنس اور لباس کے معاملے میں پابندی کسی چیز پر نہیں۔ اس لیے کہ ایسی پابندیاں ان کے خیال میں انفرادی آزادی کے خلاف ہیں، تاہم سوسائٹی کے اپنے قواعد اور اقدار موجود ہیں جن کا خیال رکھا جاتا ہے۔

امریکہ کی ایک قدر سیکولرزم ہے۔ تاہم یہ سیکولرزم بعض یورپی ممالک کے سیکولرزم سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں سیکولرزم کا مطلب ہر مذہب کے لیے احترام اور رواداری ہے۔ اسی لیے یہاں کسی بھی مذہب کے مطابق عبادت کرنے یا لباس پہننے پر کوئی پابندی نہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ فرانس میں مسلمان خواتین کے نقاب استعمال کرنے کو مذہب کی علامت قرار دے کر سرکاری اداروں میں ایسی خواتین کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ دوسری طرف امریکہ میں اس کو انفرادی آزادی کا مظہر قرار دے کر اس کا احترام کیا جاتا ہے۔

فلاحی مملکت کا تصور

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ دنیا کے سب سے امیر ملک میں جا بجا غربت کے مناظر موجود ہیں۔ ملک کے دارالحکومت

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.org

واشنگٹن میں، جس کی آبادی چھ لاکھ ہے، ہر وقت تقریباً پندرہ ہزار افراد بے گھر اور بے آسرا فٹ پاتھ پر بسیرا کرتے ہیں۔ یہ غربت افریقی امریکیوں یعنی کالوں اور قدیم امریکیوں یعنی ریڈ انڈینیز میں زیادہ ہے اور یورپی امریکیوں یعنی سفید فاموں میں بہت کم ہے۔ دراصل فلاحی مملکت کا امریکی تصور بھی یورپی تصور سے بہت مختلف ہے۔ یورپی فلاحی ملکوں میں ریاست مہد سے لحد تک یعنی پوری زندگی کے لیے ایک فرد کی ذمہ داری لیتی ہے، اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اسے بہت زیادہ ٹیکس لگانے پڑتے ہیں۔ اکثر حالتوں میں یہ ٹیکس آمدن کے پچاس فیصد سے زیادہ ہو جاتے ہیں چونکہ حقیقی فلاحی مملکتیں یعنی سکینڈے نیوین ملک بہت چھوٹے بھی ہیں۔ انھیں کوئی بیرونی خطرہ بھی درپیش نہیں اور انھیں بین الاقوامی تنازعات میں کوئی کردار بھی ادا نہیں کرنا ہوتا، اس لیے ان کے لیے فلاحی مملکت کے تقاضوں کو نبھانا ممکن ہو جاتا ہے۔ اس کے بالکل برعکس امریکی نقطۂ نظر یہ ہے کہ فلاحی مملکت کا تصور اپنی انتہائی شکل میں مارکیٹ اکانومی کے تصور کے خلاف ہے۔ اس کی وجہ سے عام فرد پر اتنے زیادہ ٹیکس لگ جاتے ہیں جن سے انفرادی مسابقت کا جذبہ ماند پڑ جاتا ہے اور فرد کی آزادی کا تصور مجروح ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیلز ٹیکس ہو، انکم ٹیکس ہو یا ویلتھ ٹیکس، کسی کا بھی تناسب ۵ فی صد سے زیادہ نہیں۔ اکثر ریاستوں میں انکم ٹیکس اور ویلتھ ٹیکس میں سے صرف ایک موجود ہوتا ہے۔

امریکہ میں ابتدائی بارہ برس کی تعلیم بالکل مفت ہے۔ باقی ہر چیز کے لیے ہر فرد کو کچھ نہ کچھ دینا پڑتا ہے۔ فلاحی مملکت کو امریکیوں نے ریاست کی ذمہ داری سے الگ کر کے سوسائٹی کی ذمہ داری بنا دیا ہے۔ اس لیے سارے ملک میں ایسے غیر سرکاری اداروں کا جال بچھا ہوا ہے جو کمزور طبقے کی تعلیم، صحت، کھانے اور رہایش کا خیال رکھتے ہیں جس کی وجہ سے ہر مستحق فرد ان خدمات سے مستفید ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایسے ادارے موجود ہیں جو بے سہارا لوگوں کو ناشتہ کراتے ہیں، کوئی تنظیم مستقلاً شام کے کھانے کا بندوبست کرتی ہے، کچھ تنظیمیں بے گھر لوگوں کے لیے چند ہفتوں کے لیے سر چھپانے کا بندوبست کرتی ہیں، کچھ ادارے ایسے بھی ہیں جو ہر مستحق فرد کو طبی سہولیات فراہم کرتے ہیں، خواہ وہ امریکہ میں غیر قانونی طریقے پر ہی کیوں نہ مقیم ہو۔ یہی حال تعلیم کا ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی باصلاحیت طالب علم سرمائے کی کمی کی وجہ سے تعلیم سے محروم رہ جائے۔ کوئی نہ کوئی غیر سرکاری فلاحی تنظیم اس کو سنبھال لے گی۔

امریکہ کا جمہوری نظام

برطانوی جمہوریت کے برعکس امریکی جمہوریت براہ راست ہے۔ یعنی پارلیمانی کے بجائے صدارتی نظام ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ امریکہ کے اندر بے شمار چیزیں برطانیہ سے الٹ ہیں۔ وہاں ٹریفک بائیں ہاتھ ہے اور یہاں دائیں ہاتھ، وہاں کلومیٹر ہیں اور یہاں میل، وہاں بجلی دو سو بیس وولٹ ہے اور یہاں اس سے الٹ، وہاں لوگ اور بچے خاموش رہتے ہیں، بغیر تعارف کے ایک دوسرے سے گفتگو کے روادار نہیں ہوتے، یہاں لوگ اور بچے خوب شور مچاتے ہیں اور ایک دوسرے سے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

گفتگو اور ہنسی مذاق کے بہانے تلاش کرتے رہتے ہیں، وہاں بجلی کے سوئچ اوپر سے نیچے کی طرف آن ہوتے ہیں، یہاں نیچے سے اوپر کی طرف آن ہوتے ہیں۔ غرض یہ کہ یوں لگتا ہے جیسے امریکیوں نے ہر چیز جان بوجھ کر انگریزوں سے الٹ رکھی ہے۔ بہرحال یہ براہ راست جمہوریت ہر جگہ ہے۔ میئر ہو، ریاست کا گورنر ہو، عدالت کا جج ہو یا ملک کا صدر، ہر کوئی براہ راست عوامی ووٹ سے منتخب ہوتا ہے۔

دو یا تین پارٹی نظام

مدت دراز سے امریکہ میں دو پارٹی نظام رائج ہے ایک ریپبلیکن پارٹی اور دوسری ڈیموکریٹک پارٹی۔ وقتاً فوقتاً کوئی تیسری پارٹی بھی ابھر کر کچھ عرصے کے لیے ارتعاش پیدا کرتی ہے، مگر جلد بیٹھ جاتی ہے۔ جیسے آج کل گرین پارٹی بھی میدان میں موجود ہے۔ اگرچہ ابھی تک اس کی بنیادیں مضبوط نہیں ہوسکیں۔

امریکہ میں دو پارٹی نظام کو قائم ہوتے اور جڑ پکڑتے پکڑتے بہت وقت لگا ہے۔ ریپبلیکن پارٹی امریکی کلچر، امریکی اقدار اور امریکہ کی بالاتری پر یقین رکھتی ہے۔ یہ پارٹی خاندانی اقدار اور مذہب کی طرف نسبتاً زیادہ مائل ہے۔ خارجہ تعلقات کے ضمن میں یہ پارٹی امریکی مفادات کو بہت زیادہ دیکھتی ہے۔ اس کے برعکس ڈیموکریٹک پارٹی انسانی حقوق، عورتوں، اقلیتوں، مزدور طبقہ اور تارکین وطن کی جانب ہمدردانہ رویہ رکھتی ہے۔ تاہم ان دونوں پارٹیوں میں نمایاں حد فاصل تلاش کرنا مشکل ہے۔ ہر پارٹی کے اندر خیالات کے اعتبار سے مزید تین گروپ بن جاتے ہیں۔ یعنی لبرل، ماڈریٹ اور کنزرویٹیو۔ ان مختلف شیڈز کی وجہ سے بسا اوقات بڑی دلچسپ صورت حال بن جاتی ہے۔ مثلاً ایک کنزرویٹیو ڈیموکریٹک کے خیالات اور ایک لبرل ریپبلیکن کے نظریات میں حقیقتاً کوئی فرق نہیں ہوتا۔ دونوں پارٹیوں کے ماڈریٹ بھی تقریباً ہم رنگ ہی ہوتے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

پارٹیوں کی اصل تنظیم ریاستی سطح پر ہوتی ہے۔ ملکی سطح کی تنظیم بڑی ڈھیلی ڈھالی ہوتی ہے اور وہ صرف صدارتی انتخاب کے موقع پر سرگرم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کا کوئی کام نہیں ہوتا۔

ہر ووٹر کو اجازت ہوتی ہے کہ وہ ووٹرز لسٹ میں اپنے آپ کو بطور ریپبلیکن یا ڈیموکریٹ یا کسی بھی پارٹی کے ساتھ ملحق ظاہر کرے اور چاہے تو آزاد رہے۔ جب وہ اپنے آپ کو کسی پارٹی سے وابستہ ظاہر کرے گا تو وہ خود بخود اس پارٹی کے تمام معاملات میں بطور رکن ووٹ دینے کا اہل ہو جائے گا۔ وہ جب چاہے اپنی وابستگی تبدیل کر سکتا ہے۔

امیدواروں کا چناؤ

امریکہ میں پارٹی ڈکٹیٹر شپ کا کوئی تصور نہیں ہے۔ ہر عہدہ کے لیے اپنی پارٹی کے امیدوار کا چناؤ بھی اس حلقے سے تعلق رکھنے والے پارٹی ممبر کرتے ہیں۔ اس کا طریقہ یوں ہوتا ہے کہ مثلاً ایک ریاست سے ریپبلیکن پارٹی کی طرف سے سینٹ کی ایک سیٹ کے لیے دو افراد امیدوار ہیں۔ یہ دونوں افراد اپنے لیے بھرپور انتخابی مہم چلائیں گے۔ بالکل ایسے ہی جیسے عام

انتخابات میں ہوتا ہے۔ایک خاص تاریخ کو ریاست میں ''پرائمریز'' یعنی پرائمری الیکشن ہوں گے۔(ان پرائمریز میں مختلف عہدوں کے لیے دوسرے امیدوار بھی اپنی اپنی پارٹی کے اندر انتخاب لڑ رہے ہوں گے)۔جن ووٹروں نے اپنے آپ کو بحیثیت ریپبلیکن ووٹر رجسٹرڈ کیا ہوگا، وہ ان دونوں امیدواروں میں سے کسی ایک کو ووٹ دیں گے۔اس طرح جو امیدوار بھی پارٹی کا یہ اندرونی انتخاب جیت جائے گا۔وہ ریاستی انتخاب میں مخالف پارٹی کے امیدوار کے ساتھ مقابلہ کرے گا۔گویا یہاں پارٹی کی سنٹرل ایگزیکٹیو یا سنٹرل پارٹی ٹکٹ کمیٹی کی اجارہ داری کا کوئی تصور نہیں۔

ریاستی اسمبلی اور اس کے اختیارات

امریکہ سے باہر لوگ سمجھتے ہیں کہ اس ملک کے اندر شاید صدر، کانگریس اور سینٹ ہی سب کچھ ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ امریکی وفاق کے پاس چند ہی اختیارات ہیں جب کہ عام انسان سے تعلق رکھنے والے تمام تر اختیارات ریاست یعنی صوبے کے پاس ہوتے ہیں۔ریاست کا گورنر بھی براہ راست منتخب ہوتا ہے اور ریاستی اسمبلی بھی براہ راست منتخب ہوتی ہے۔گورنر کے پاس عمومی انتظامی اختیارات ہوتے ہیں جب کہ ریاستی اسمبلی قانون سازی کرتی ہے اور بجٹ پاس کرتی ہے۔

وفاقی کانگریس

یہ ایوان درحقیقت دو حصوں پر مشتمل ہے۔ایک ایوان نمائندگان اور دوسرا سینٹ۔ان دونوں کے مجموعے کو کانگریس کہا جاتا ہے، مگر کبھی کبھی ایوان نمائندگان کو بھی کانگریس کہہ دیا جاتا ہے۔ایوان نمائندگان کا ہر رکن آبادی کی بنیاد پر منتخب کیا جاتا ہے۔آج کل اس کے ارکان کی تعداد چار سو ہے۔جب کہ ہر ریاست سے دو سینیٹر منتخب کیے جاتے ہیں۔اس طرح سینیٹرز کی تعداد ہمیشہ ایک سو رہتی ہے۔ایوان نمائندگان کی میعاد صرف دو برس ہوتی ہے اور سینٹ کی میعاد چھ برس۔ہر دو سال بعد ایک تہائی سینیٹرز ریٹائر ہو جاتے ہیں اور ان کے انتخاب کے لیے پوری ریاست کو حلقہ تصور کیا جاتا ہے۔ایوان نمائندگان کے لیے اتنی مختصر میعاد اس لیے رکھی گئی ہے تاکہ وہ کبھی بھی اپنے حلقۂ انتخاب کے عوام سے کٹنے نہ پائیں اور الیکشن میں کامیاب ہوتے ہی وہ اگلے الیکشن کے لیے تیاری شروع کر دیں۔ہفتے میں عام طور پر ایوان نمائندگان کے ہر رکن کے تین چار دن واشنگٹن میں گزرتے ہیں اور تین یا چار دن اپنے حلقۂ انتخاب میں۔حقیقت یہ ہے کہ ایوان نمائندگان کے رکن کی حیثیت سے ذمہ داری سرانجام دینا ایک مشکل کام ہے۔

سینٹ کی میعاد چھ برس اس لیے رکھی گئی ہے تاکہ ایک دفعہ منتخب ہونے کے بعد ان اراکین پر اپنے حلقۂ انتخاب کا زیادہ دباؤ نہ رہے اور وہ اطمینان و دلجمعی کے ساتھ قانون سازی کا کام کر سکیں۔تاہم ان کو بھی اپنے حلقۂ انتخاب سے پورا رابطہ رکھنا پڑتا ہے، اس لیے کہ ان کا انتخاب (پاکستان کے برعکس) ریاستی اسمبلیاں نہیں، بلکہ براہ راست عوام کرتے ہیں۔ہر نمائندے کا واشنگٹن میں ایک دفتر اور اپنے حلقے میں پانچ چھ دفاتر ہوتے ہیں۔ان دفاتر کا اسٹاف وہ خود مقرر کرتا ہے اور اس کے اخراجات حکومت برداشت کرتی ہے۔اس طرح وہ ہمہ وقت اپنے حلقۂ انتخاب سے رابطے میں رہتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کسی بھی مسئلے پر بحث، موقف سازی اور ووٹنگ کے وقت کسی بھی ممبر کے لیے پارٹی ڈسپلن کا خیال رکھنا ضروری نہیں ہوتا۔ ہر ممبر اپنے ضمیر کے مطابق بات کرتا ہے اور ووٹ دیتا ہے۔ ممبر کے لیے پارٹی تبدیل کرنے یا اپنی پارٹی چھوڑ کر آزاد ممبر بننے پر بھی کوئی قانونی پابندی نہیں۔ تاہم ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ پچھلے دس سال میں شاید صرف ایک دفعہ ایسا ہوا ہے کہ ایک رکن نے برسر اقتدار پارٹی چھوڑ کر آزاد ممبر بننے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

صدارتی انتخابات

امریکہ کے صدارتی انتخابات کا طریق کار انتہائی دلچسپ اور پیچیدہ ہے۔ سب سے پہلے ہر ریاست کے اندر ہر بڑی پارٹی کے امیدواروں کے درمیان باہمی مقابلہ ہوتا ہے۔ مثلاً اگر ڈیموکریٹک پارٹی کی طرف سے تین افراد صدارتی امیدوار بننا چاہتے ہیں تو ان میں سے ایک متفقہ امیدوار کے انتخاب کے لیے آپس میں مقابلہ ہوگا۔ اس انتخاب کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریقہ، جس کے لیے ریاست آئیوا بہت شہرت رکھتی ہے، کاکس (Caxcus) کا طریقہ کہلاتا ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ ایک چھوٹے یونٹ (مثلاً کسی چھوٹے قصبے) کے اس پارٹی سے تعلق رکھنے والے افراد ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ ہر فرد اپنے پسندیدہ امیدوار کا نام لیتا ہے۔ اگر امیدوار زیادہ ہوں تو سب سے کم ووٹ لینے والے امیدوار کا نام ڈراپ ہوتا رہتا ہے اور نئے سرے سے انتخاب ہوتا ہے حتیٰ کہ آخر میں دو امیدوار رہ جاتے ہیں اور ان دونوں میں سے کوئی ایک یہ کاکس جیت لیتا ہے۔ یہ تمام پراسیس ایک ہی وقت میں پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ اس طرح جب ریاست کے تمام کاکسوں کے نتائج آ جاتے ہیں تو جس امیدوار نے زیادہ کاکس (نہ کہ زیادہ ووٹوں کی تعداد) میں کامیابی حاصل کی ہوتی ہے، اسے اس ریاست کی طرف سے فاتح قرار دیا جاتا ہے۔ تاہم اس کامیابی سے کوئی امیدوار واقعتاً امیدوار نہیں بن جاتا، اس لیے کہ اس ضمن میں اصل فیصلہ قومی نامزدگی کنونشن (National Nominating Convention) کے ڈیلی گیٹس کے اکثریتی ووٹ سے ہوتا ہے۔ اب اکثر ریاستوں میں کاکس کا رواج نہیں رہا۔

کسی پارٹی کے صدارتی امیدوار کا اصل فیصلہ ڈیلی گیٹس کرتے ہیں۔ اس موقع کے لیے ہر ریاست میں ''پرائمریز'' منعقد ہوتے ہیں۔ ان پرائمریز کے لیے ہر امیدوار اپنا پینل کھڑا کرتا ہے۔ ڈیلی گیٹس کی تعداد ریاست کی آبادی کی تناسب سے ہوتی ہے۔ ہر ریاست میں باقاعدہ سرکاری طور پر الیکشن منعقد ہوتا ہے جس میں اس پارٹی سے تعلق رکھنے والے ممبر ڈیلیگیٹس کا انتخاب کرتے ہیں۔ (یہ بات پہلے بیان کی چکی ہے کہ الیکشن کمیشن کے پاس بحثیت ووٹر اپنے آپ کو رجسٹر کراتے وقت ہر فرد کو اختیار ہے کہ وہ چاہے تو اپنی پسندیدہ پارٹی کا نام بتائے یا آزاد رہے۔ پسندیدہ پارٹی کا نام بتانے والا خود بخود اس پارٹی کا ممبر بن جاتا ہے۔) اس انتخاب سے پہلے بھی پورے ملک میں ہر امیدوار اپنی پارٹی کے اندر اپنی انتخابی مہم چلاتا ہے۔ جب تمام ریاستوں سے ڈیلی گیٹ منتخب ہو جاتے ہیں تو پھر نیشنل کنونشن منعقد ہوتا ہے جس میں متفقہ امیدوار کا باقاعدہ اعلان کیا جاتا ہے۔ نتیجہ ہر کسی کو پہلے سے ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہر ریاست کی پارٹی ''الیکٹرل کالج''، یعنی انتخابی ادارے کے افراد

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

کا تقرر کرتی ہے۔ ان کی تعداد ہر ریاست کے اراکین سینٹ اور اراکین ایوان نمائندگان کی مجموعی تعداد کے برابر ہوتی ہے۔ یہ افراد عام طور پر پارٹی کے وفادار ترین ارکان ہوتے ہیں۔ امریکہ میں ہر چوتھا سال صدارتی انتخابات کا سال ہوتا ہے۔ اس سال نومبر کی پہلی پیر کو صدارتی انتخابات کے لیے پولنگ ہوتی ہے، لیکن یوں نہیں ہوتا کہ جس امیدوار نے سب سے زیادہ ووٹ لے لیے ہوں، اسے کامیاب قرار دے دیا جائے، بلکہ ہوتا یوں ہے کہ جس ریاست میں جس امیدوار کو زیادہ ووٹ پڑے ہوتے ہیں، اس ریاست سے اس پارٹی کا پورا الیکٹرل کالج کامیاب قرار دے دیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی ریاست میں الیکٹرل کالج کے ارکان کی تعداد دس ہے۔ اس ریاست میں تین لاکھ عام ووٹ ریپبلیکن پارٹی کا امیدوار لے لیتا ہے۔ دو لاکھ نوے ہزار ووٹ ڈیموکریٹک پارٹی کے امیدوار کے حق میں پڑ جاتے ہیں اور ایک لاکھ ووٹ گرین پارٹی لے لیتی ہے۔ تو اس ریاست سے ریپبلیکن پارٹی کے دس کے دس ارکان الیکٹرکل کالج کامیاب قرار دے دیے جائیں گے۔

صدارت کا اصل فیصلہ عام ووٹوں کی اکثریت کی بنیاد پر نہیں، بلکہ تمام ریاستوں کے الیکٹرل کالج کے ارکان کی اکثریتی رائے سے ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ عین ممکن ہے کہ عام اکثریتی ووٹ ایک امیدوار کے حق میں پڑے ہوں اور بالفعل دوسرا امیدوار الیکٹرل کالج کے ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب ہو جائے۔ مثلاً ۲۰۰۰ء کے انتخاب میں اکثریتی ووٹ الگور کے حق میں پڑے تھے، مگر الیکٹرل کالج کے طریقۂ کار کی وجہ سے جارج بش الیکشن جیت گئے۔

اگرچہ الیکٹرل کالج کے افراد سرکاری طور پر عام انتخاب کے چند دن بعد ووٹ دیتے ہیں۔ تاہم عام ووٹوں کی گنتی مکمل ہوتے ہی الیکٹرل کالج میں ہر پارٹی کے ارکان کی تعداد خود بخود معلوم ہو جاتی ہے، اس لیے غیر سرکاری طور پر فوری اعلان کامیابی ممکن ہوتا ہے۔

بادی النظر میں الیکٹرل کالج کا ادارہ بالکل غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ تاہم امریکیوں کے خیال میں دو نکات کی بنیاد پر اس کی افادیت ہے۔ ایک یہ کہ اس سے ہر ریاست کی طاقت اور اہمیت کا اظہار ہوتا ہے۔ اور اس طریقۂ کار کی وجہ سے کسی چھوٹی ریاست کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، دوسرا یہ کہ اس نظام کی وجہ سے کسی تیسری پارٹی کے لیے میدان پر قبضہ یا تیسرے امیدوار کی جیت عملاً ناممکن ہو جاتی ہے۔ اس لیے تیسری پارٹی یا تیسرا امیدوار کسی بڑی پارٹی کے ووٹ تو خراب کرنے کا باعث بن سکتا ہے یا اپنا احتجاج تو ریکارڈ کر سکتا ہے، مگر عملاً وائٹ ہاؤس پر قبضہ نہیں کر سکتا۔

امریکی انتخابات میں سیاسی اخلاقیات کی اہمیت

درج بالا صفحات میں امریکی انتخابی نظام کا جو مختصر سا خاکہ بیان کیا گیا ہے، اس سے ایک عام قاری بھی یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ اگر سیاست دانوں میں سے کچھ مفسد اور بیمار ذہن کے لوگ اس سسٹم سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہیں تو ایک مختصر عرصے میں یہ نظام بالکل بیٹھ سکتا ہے۔ مثلاً اس نظام کے تحت اگر کوئی پارٹی چاہے تو اپنی مخالف پارٹی کی طرف سے ایک نسبتاً کمزور امیدوار کو نامزد کرا سکتی ہے۔ وہ یوں کہ یہ پارٹی اپنے کچھ لوگوں کو مخالف پارٹی کا رکن بنوا دے اور وہ پرائمریز میں کسی کمزور

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

امیدوار کے حق میں رائے دے دیں۔ اسی طرح امریکی سسٹم میں فلور کراسنگ پر کہیں بھی کوئی پابندی نہیں ہے۔ اسی طرح کسی پارٹی کے منتخب ممبر پر ایسی کوئی پابندی نہیں ہے کہ اسے لازماً اپنی پارٹی پالیسی یا پارٹی لائن یا کسی خاص موقف کے حق میں ووٹ دینا ہے۔ اس پر واحد قدغن اس کے اپنے ضمیر کی ہے۔ حتیٰ کہ الیکٹرل کالج کے ارکان، جن کا واحد کام اپنے صدارتی امیدوار کے حق میں چار برس میں صرف ایک دفعہ ووٹ دینا ہوتا ہے، یہ بھی اپنے پارٹی امیدوار کے حق میں ووٹ دینے کی پابند نہیں ہے۔ اس لیے ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ بعض اوقات کسی پارٹی کا کوئی الیکٹرل کالج کا رکن علی الاعلان اپنی پارٹی کے صدارتی امیدوار کے خلاف بطور احتجاج ووٹ دیتا ہے۔ اور اس کے ساتھ وہ بتا دیتا ہے کہ وہ کس بات پر علامتی احتجاج کر رہا ہے۔ یہ احتجاج بھی وہ صرف اس وقت کرتا ہے جب اسے یہ علم ہو کہ اس کے مخالفانہ ووٹ سے اس کی پارٹی کے امیدوار کی جیت یا ہار پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اور مزید لطف کی بات یہ کہ کسی بھی معاملے میں مخالفانہ ووٹ دینے والے کسی بھی منتخب یا غیر منتخب رکن کو پارٹی سے بھی نہیں نکالا جا سکتا، اس لیے کہ امریکہ میں کسی فرد کو پارٹی سے نکالنے کا کوئی سسٹم موجود ہی نہیں۔ گویا امریکی سیاسی نظام میں بے شمار خامیاں (loop-holes) موجود ہیں۔ اگر اس سسٹم کو کوئی چیز تھامے ہوئے ہے تو وہ امریکی سیاست دانوں کا اجتماعی سیاسی اخلاقیات اور اپنے ضمیر کی آواز پر سختی سے جمے رہنا ہے۔ فی الوقت یہ کہا جا سکتا ہے کہ امریکی سیاست دان اجتماعی سیاسی اخلاقیات کی عمومی پیروی کرتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

میڈیا اور سیاست

امریکی میڈیا، خواہ وہ پرائیویٹ ٹی وی چینل ہوں یا اخبارات، بنیادی طور پر کمرشل ادارے ہوتے ہیں۔ تاہم ان میں سے ہر ادارے کا اپنا ایک موقف، طرز فکر اور بنیادی تجزیہ بھی ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ ادارے سیاست و حکومت کے لیے ایک بے رحم محتسب کا کردار بھی ادا کرتے ہیں۔ عوام کو نت نئی چیزوں سے روشناس کرنے کی دوڑ میں ہر ادارے کی اپنی انویسٹی گیشن ٹیمیں ہوتی ہیں۔ وہاں کی اصل رپورٹنگ ہوتی ہی تحقیقاتی ہے۔ سیاسی لیڈر اول تو بیانات دیتے ہی نہیں اور اگر دیں بھی تو انھیں کوئی چھاپنے کا تکلف گوارا نہیں کرتا۔ قانونی طور پر بھی صحافیوں (بلکہ ہر امریکی) کو ہر محکمے اور شعبے کے متعلق سب کچھ جاننے کا اختیار ہوتا ہے۔ اس لیے عملاً کوئی بات چھپانی ناممکن ہو جاتی ہے۔ اس سخت گیر نقاد کے ہوتے ہوئے کوئی سیاست کار یا ذمہ دار فرد کوئی غلط کام کرتے ہوئے ہزار مرتبہ سوچتا ہے۔ واٹر گیٹ اسکینڈل کو طشت از بام کرنے کا کارنامہ ایک صحافی نے ہی انجام دیا تھا۔ ہوا یوں تھا کہ ریپبلیکن پارٹی کے کچھ لوگوں نے ڈیموکریٹک پارٹی کے مرکزی دفتر واٹر گیٹ بلڈنگ میں جاسوسی آلات نصب کر دیے تھے تاکہ ان کی نج کی گفتگو سے باخبر رہا جا سکے۔ اس اسکینڈل کے نتیجے میں نکسن جیسے طاقت ور صدر کو وہائٹ ہاؤس سے رخصت ہونا پڑا تھا۔

عدلیہ اور جمہوریت

امریکی نظام کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ وہاں ریاستی سطح پر کئی جج بھی یا تو منتخب کیے جاتے ہیں اور یا ان کو عام ووٹرز کی

تائید یا عدم تائید کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ گویا اگر کوئی جج سست اور کام چور ہو، اس کے فیصلے مفاد عامہ اور مصالح عمومی کے مطابق نہ ہوں یا اس کی عمومی شہرت ٹھیک نہ ہو تو عوام اسے کرسی عدالت سے کھینچ سکتے ہیں۔

وفاقی عدالت کی نشست کے لیے اصل نامزدگی تو صدر کرتا ہے، مگر اس کی نامزدگی کی توثیق دونوں ایوانوں پر مشتمل کمیٹی کے ذریعے سے کی جاتی ہے۔ چونکہ دونوں ایوانوں میں دونوں پارٹیوں کی نشستوں میں محض انیس بیس ہی کا فرق ہوتا ہے، اس لیے کمیٹی میں دونوں پارٹیوں کے ارکان کی تعداد تقریباً برابر ہوتی ہے۔ اس کا عملاً مطلب یہ ہے کہ ہر جج کی تقرری پر صدر اور دونوں بڑی پارٹیوں کا اتفاق رائے ضروری ہے۔ عدالت عالیہ کا جج کبھی ریٹائرڈ نہیں ہوتا۔ اگر عمر رسیدگی کی بنا پر وہ خود کرسی عدالت چھوڑنا چاہے، تو الگ بات ہے، مگر مواخذے کی کسی تحریک کو چھوڑ کر اسے برطرف نہیں کیا سکتا۔ اس طرح وہ ہر طرح کے دباؤ اور ترغیب و تحریص سے بالاتر ہو کر فیصلے کرتا ہے۔

انتخابات اور دولت

امریکی انتخابات میں دولت کا بے تحاشا استعمال ہوتا ہے۔ کانگریس کا ہر امیدوار چار سے لے کر دس ملین ڈالر تک خرچ کرتا ہے۔ گویا چوبیس کروڑ سے لے کر ساٹھ کروڑ روپے تک۔ سینٹ کا ہر امیدوار چھ سے لے کر بیس ملین ڈالر یعنی چھتیس کروڑ روپے سے ایک ارب بیس کروڑ روپے تک صرف کرتا ہے۔ جب کہ صدارتی انتخاب میں ہر امیدوار کی طرف سے چار سو سے لے کر چھ سو ملین ڈالر یعنی دو ارب چالیس کروڑ سے لے کر تین ارب ساٹھ کروڑ روپے تک صرف ہوتے ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس رقم کے آمد و خرچ کا مکمل حساب رکھا جاتا ہے۔ انتخاب کے لیے ہر فرد ایک خاص حد تک ایک امیدوار کو چندہ دے سکتا ہے، جب کہ اداروں کے لیے بعض حالات میں حد موجود ہے اور بعض حالات میں کوئی حد نہیں۔ تمام ادارے یہ رقم علی الاعلان دیتے ہیں اور اس لیے دیتے ہیں کہ ان کا پسندیدہ امیدوار اقتدار میں آ کر ان کے مفادات کا تحفظ کرے۔

امیدواروں کا ایک بڑا وقت اپنے لیے چندہ اکٹھا کرنے میں گزرتا ہے۔ درحقیقت یہ بھی عوامی رابطے اور مختلف اداروں اور گروپوں کے مسائل اور نقطۂ نظر جاننے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ہر بڑے چندے کے لیے کوئی پروگرام منعقد کیا جاتا ہے جس میں باہمی دلچسپی کے امور پر تقاریر اور تبادلۂ خیال ہوتا ہے۔ چندے کی اس رقم کے ایک ایک پیسے کا حساب کتاب رکھا جاتا ہے۔ اس کا باقاعدہ آڈٹ ہوتا ہے۔ اگرچہ نظری طور پر اس میں خرد برد کے بہت سے امکانات ہو سکتے ہیں، مگر عملاً اس میں خرد برد کا تصور ناپید ہے۔ اس رقم کا ایک بڑا حصہ ٹی وی اور اخبارات کے اشتہارات کے لیے خرچ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ باقی اخراجات تو ہوتے ہی ہیں۔

صدر اور کانگریس کے اختیارات اور ملکی بجٹ

امریکی جمہوریت میں فیصلہ سازی کا ایک پیچیدہ نظام ہے جس کی اصل روح یہ ہے کہ کوئی بھی فرد یا ادارہ من مانی کی حد

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تک طاقت ور نہ ہونے پائے۔ ہر اہم معاملے کے لیے یہ لازم ہے کہ صدر، سینٹ اور ایوان نمائندگان، تینوں اس کی منظوری دے دیں۔اس کی سب سے نمایاں مثال بجٹ ہے۔ بجٹ مارچ میں سینٹ اور ایوان نمائندگان میں پیش ہوتا ہے۔ پھر بجٹ کے ہر اہم حصے کے متعلق دونوں ایوانوں کی علیحدہ علیحدہ کمیٹیاں بن جاتی ہے۔تقریباً ہر سینیٹر یا کانگریس مین کسی نہ کسی کمیٹی کا رکن ہوتا ہے۔ ہر کمیٹی میں بجٹ کے ایک ایک پہلو کی بال کی کھال اتاری جاتی ہے۔صدر کے نمائندے ہر کمیٹی میں آ کر اپنا کیس پیش کرتے ہیں اور جرح کا جواب دیتے ہیں۔عموماً یہ ہوتا ہے کہ تقریباً ہر معاملے میں تینوں اداروں میں اتفاق رائے نہیں ہو پاتا۔ چنانچہ تینوں اداروں کی کمیٹیوں پر مشتمل ایک اور کمیٹی بنتی ہے جو افہام وتفہیم اور کچھ لو اور کچھ دو کے تحت ہر معاملے میں اتفاق رائے تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے۔عموماً بجٹ کی منظوری کا یہ معاملہ اکتوبر تک یعنی چھ مہینے میں پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے۔اگرچہ اکتوبر بھی اس کے لیے کوئی ڈیڈ لائن نہیں ہے۔لیکن عموماً نومبر میں مختلف انتخابات ہوتے ہیں جن میں ہر سینیٹر اور کانگریس مین کو اپنا کردار ادا کرنا ہوتا ہے۔اس لیے سب لوگ کوشش کرتے ہیں کہ اکتوبر تک کوئی فیصلہ ہو جائے۔تاہم اگر فیصلہ نہ ہو سکے تو پرانے بجٹ کی مختص کردہ رقم کے مطابق خرچ جاری رہتا ہے۔

تقریباً تمام معاملات میں یہی طریقہ کار رفرما رہتا ہے۔البتہ ایمر جنسی کے معاملات میں سینٹ اور ایوان نمائندگان، دونوں ازخود اپنی کارروائی کی رفتار تیز تر کر دیتے ہیں۔اس سے امریکی نظام میں گفتگو اور مکالمے کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کمیٹی سسٹم

دونوں ایوانوں میں کئی کمیٹیاں بنائی جاتی ہیں۔جن میں بعض مثلاً ڈیفنس کمیٹی یا خارجہ تعلقات کی کمیٹی بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ان کمیٹیوں کے اجلاس سارا سال جاری رہتے ہیں۔ گویا ہر ممبر اپنے ایوان یا کمیٹی کے اجلاسوں میں سارا سال مصروف ہوتا ہے۔عموماً یہ اجلاس ہفتے میں چار دن ہوتے ہیں تا کہ ہر ممبر تین دن اپنے حلقے میں گزار سکے۔اصل فیصلے انھی کمیٹیوں میں ہوتے ہیں۔ پھر انھیں ایوان کے فلور پر لایا جاتا ہے۔

لابئینگ سسٹم

امریکی جمہوری نظام کا ایک دلچسپ پہلو وہاں کا لابی سسٹم ہے۔امریکہ کے داخلی سیاسی مرکز واشنگٹن میں مختلف لابیٹس (lobbiests) کے سترہ ہزار سے زیادہ دفاتر ہیں، گویا سترہ ہزار سے زیادہ ادارے مختلف ملکوں، انجمنوں، تنظیموں اور افراد کے لیے لابئینگ کرر ہے ہیں۔

یہ لابئینگ سسٹم کیا ہے۔اختصار کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ امریکہ کا ہر ادارہ یہ چاہتا ہے کہ اس کی ضروریات اور حالات کے مطابق قانون سازی ہو اور اس کے مفادات کے خلاف کوئی قانون سازی نہ ہو (۔مثلاً ڈاکٹر یہ چاہتے ہیں کہ کوئی ایسا قانون نہ بنے جس سے ان کے لیے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔) چونکہ ان اداروں کے پاس خود وقت نہیں ہوتا، اس لیے یہ لوگ

اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے کسی لابی فرم کی خدمات حاصل کر لیتے ہیں ۔ یہ فرمیں قانون ساز ادارے میں پیش کردہ بلوں اور قوانین پر نظر رکھتی ہیں، اپنے حق میں مثبت قانون سازی کرتی ہیں، کسی قانون کو ختم کرنا ہو یا کسی زیر تجویز قانون کا راستہ روکنا ہو، یہ فرمیں مختلف سینیٹرز اور کانگریس کے اراکین سے ملاقات کرتی ہیں، انھیں قائل کرنے کی کوشش کرتی ہیں ۔ انھیں متعلقہ لٹریچر اور دستاویزات فراہم کرتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

بعض اوقات یہ لابئیسٹ فرمیں ایسے ہتھ کنڈوں سے بھی کام لیتی تھیں جنھیں کرپشن کے زمرے میں شمار کیا جا سکتا تھا۔ مثلاً یہ مخصوص ارکان کانگریس کو خوبصورت سمندری ساحلوں پر دو تین دن کے لیے لے جا کر ان کے اور ان کے اہل خاندان کے لیے قیام وطعام کا بندوبست کرتی تھیں تا کہ انھیں اپنے موقف سے ''روشناس'' کرایا جا سکے ۔ تاہم تقریباً دس سال پہلے اس ضمن میں کی جانے والی سخت قانون سازی نے اس طرح کے طریقوں کو ختم کر دیا۔

تھنک ٹینک

امریکہ کے اندر ایسے کئی غیر جانب دار یا جانب دار ادارے ہیں جو مختلف اہم مسائل پر ماہرین سے تحقیقاتی رپورٹس مرتب کراتے ہیں، ان کے آپس میں مکالمے اور بحث کا اہتمام کرتے ہیں اور پھر اپنے نتائج فکر کو میڈیا اور عوامی نمائندوں کے سامنے پیش کرتے ہیں اور تحقیقاتی رپورٹس کی صورت میں شائع بھی کراتے ہیں۔ ان میں ایسے ادارے بھی ہیں جو کسی حکومتی ادارے سے فنڈ نہیں لیتے ۔ بسا اوقات کسی نام ور صنعت کار یا تاجر نے اس طرح کے کسی ادارے کے لیے خطیر رقم مختص کی ہوتی ہے، جس کے سود سے یہ ادارہ چلتا ہے ۔ چونکہ یہ ادارے عموماً کسی کے زیر اثر نہیں ہوتے اور انھوں نے تجربہ کار مسلمہ ماہرین کی خدمات حاصل کی ہوتی ہیں، اس لیے ان کی آرا کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے اور عوامی نمائندے کوئی قانون نافذ کرتے یا پالیسی بناتے وقت ان تھنک ٹینکس کے نتائج فکر سے استفادہ لازم سمجھتے ہیں ۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

امریکہ بحیثیت سپر پاور

آج دنیا میں امریکہ بلا شرکت غیرے عظیم ترین طاقت ہے ۔ دنیا کی پوری تاریخ میں کوئی ملک اتنا امیر اور اتنا طاقت ور کبھی نہیں بنا تھا جتنا آج امریکہ ہے ۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا کے اندر ایک نئی مساوات نے جنم لیا۔ اس جنگ سے پہلے برطانیہ، فرانس، جرمنی اور جاپان بھی سپر طاقت کہلائے جاتے تھے، مگر اس کے بعد ان سب کی حیثیت ثانوی ہو گئی اور اصل اہمیت امریکہ اور روس کی ہو گئی ۔ امریکہ اس لیے سپر پاور بنا کہ اس جنگ میں اسے کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا تھا اور روس اس لیے سپر پاور بنا کہ اس کے پاس بہت بڑا علاقہ، زمین اور وسائل موجود تھے ۔ کاروبار حکومت چلانے کے لیے لاکھوں افراد پر مشتمل کمیونسٹ پارٹی کے جاں بازوں اور مخلص ترین افراد کی ٹیم اور نظریۂ حیات کے طور پر ایک توانا، پرعزم اور کروڑوں

لوگوں کے دلوں کو گرمانے اور متحدر کھنے والا نظریہ موجود تھا۔ یہ دونوں ممالک ایک دوسرے سے بالکل متضاد معاشی نظریے کے حامل ملک تھے، اس لیے دونوں کے درمیان آویزش قدرتی تھی۔ تاہم اس آویزش کو جس چیز نے مہمیز دی وہ روس کی توسیع پسندانہ پالیسی تھی جس کے مطابق اس کی نظریاتی ذمہ داری تھی کہ وہ اس انقلاب کو پوری دنیا میں برپا کرے اور اس کا قائد بنے۔ اس پالیسی نے امریکہ کو یہ جواز فراہم کیا کہ چونکہ روس کے ان ارادوں کی وجہ سے پوری آزاد دنیا کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ امریکہ اسے لگام دے اور اس کی بین الاقوامی خواہشات کے مقابلے میں رکاوٹ بنے۔ چنانچہ اگلے چالیس برس یہ مقابلہ جاری رہا جس میں فیصلہ کن فتح امریکہ کو اس وقت حاصل ہوئی جب کمیونسٹ سوویت یونین کے حصے بخرے ہو گئے۔ اس معرکے میں امریکہ کیوں جیتا اور سوویت یونین کیوں ہارا۔ اس کی نظری وجوہات ہم بالواسطہ بیان کریں گے۔ یہ موضوع بذات خود ایک مفصل تحریر کا متقاضی ہے۔ اس لیے اس تحریر میں ہم اس کی عملی تفصیلات سے صرف نظر کر لیتے ہیں۔

سپر پاورز کی نفسیات

دنیا کی پوری تاریخ میں سپر پاورز کی ہمیشہ سے ایک ہی نفسیات رہی ہے۔ اس کو ایک فقرے میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ایک سپر پاور یہ چاہتی ہے کہ وہ مستقلاً ایک سپر پاور کے طور پر قائم رہے اور اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے وہ سب کچھ کرنے پر آمادہ رہتی ہے۔

اس دنیا میں ہر فرد اور ہر قوم جدوجہد میں لگی ہوئی ہے۔ یہ جدوجہد نہ صرف زندہ رہنے کے لیے ہے، بلکہ ایک برتر حیثیت میں زندہ رہنے کے لیے ہے۔ یہاں صرف وہی افراد، نسلیں اور قومیں کامیاب ہوتی ہیں جو دوسروں سے بڑھ کر جدوجہد کریں۔ چنانچہ اس جدوجہد میں اگر کوئی قوم سب سے برتر مقام تک پہنچے تو یہ امر بالکل قدرتی ہے کہ وہ اس پوزیشن کو برقرار رکھنے کی کوشش کرے۔ اس کوشش میں اگر اس سے کوئی کوتاہی ہو جائے تو اس کا نقصان خود اسی کو پہنچے گا۔ چنانچہ اس قوم کے لیے ہر وہ فعل بالکل ٹھیک، صحیح، جائز اور مطلوب ہے جس سے وہ اس مقام پر فائز رہے۔

سپر پاور برقرار رہنے اور اس سے محروم ہونے کے عوامل

دنیا کی تاریخ عروج و زوال کی داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ ماضی کی سپر پاورز کا آج کہیں نام و نشان بھی نہیں ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ماضی کی سپر پاور آج بھی زندہ ہوتی ہے، لیکن نسبتاً کم تر حالت میں۔ ایسا کن عوامل کی بنا پر ہوتا ہے کہ ایک سپر پاور آہستہ آہستہ یا یک دم اپنی حیثیت کھو بیٹھتی ہے اور اسے دوسروں کے لیے جگہ خالی کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے؟ اس کے اصلاً چار عوامل ہیں:

۱۔ اجتماعی اخلاقیات

چند ایسی بنیادی اجتماعی صفات ہیں جن کی ایک قوم میں موجودگی اس قوم کے اندرونی اتحاد اور اس کی بقا و نمو کی ضامن

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہوتی ہیں۔ یہ صفات جتنی اعلیٰ ترین شکل میں ہوتی ہیں، وہ قوم عالمی برادری میں اتنے ہی اونچے مقام و مرتبے کی حامل ہوتی ہے اور اگر وہ سپر پاور ہو تو وہ اپنے اس مقام پر فائز رہتی ہے۔ ان میں پہلی صفت اپنے ملک، مذہب یا نظریے سے محبت، اپنے معاشرے کے ساتھ یک جہتی و یکتائی کا احساس اور ایک قومی احساس تفاخر اور بہادری ہے۔ دوسری صفت مساوات انسانی اور جمہوری کلچر ہے جس کی وجہ سے ہر انسان اپنے آپ کو پوری قوم سے جڑا ہوا محسوس کرتا ہے اور اسے خود اعتمادی حاصل ہوتی ہے۔ اور پوری قوم کے اندر جوش و جذبہ ہر وقت زندہ ہوتا ہے۔ تیسری صفت امانت و دیانت ہے۔ چوتھی صفت انصاف ہے۔ پانچویں صفت میرٹ ہے یعنی یہ کہ ہر فرد کو قابلیت و صلاحیت کی بنیاد پر جانچا جائے، رشوت و سفارش کم سے کم ہو اور سب کے لیے ترقی کے یکساں مواقع ہوں۔ چھٹی صفت محنت ہے یعنی یہ کہ سوسائٹی میں محنت کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ ساتویں صفت ملکی قانون کی پابندی ہے یعنی یہ کہ کوئی بھی اپنے آپ کو قانون سے بالاتر نہ سمجھے۔ آٹھویں صفت محروم اور کمزور طبقات کی خدمت کا توانا جذبہ ہے۔ نویں صفت تدبر، حکمت و دانش اور سوسائٹی میں مکالمے کا دور دورہ ہے۔ اور دسویں صفت قوم میں بلحاظ مجموعی صبر و استقامت کے جذبے کی موجودگی ہے۔

یہ سب خوبیاں باہم دگر مربوط ہیں یعنی ایک کی کمی سے خود دوسری میں بھی انحطاط کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ان صفات میں بھی سب سے اہم جمہوری کلچر ہے جس کے فقدان سے قومی محبت، انصاف، میرٹ اور کئی مزید پہلوؤں میں بھی کمزوری اور زوال آنا شروع ہو جاتا ہے۔ پرانے زمانے کے بادشاہوں کا زوال بھی جمہوریت کے فقدان کی وجہ سے ہوتا تھا۔ وہ یوں کہ سوسائٹی کے اندر ابتدا میں ایک خاص وقت تک تو نئے نئے علاقوں پر فتح کے نتیجے میں ملنے والی دولت کی وجہ سے جوش و جذبہ موجود رہتا تھا۔ مگر جمہوری کلچر کے فقدان کی وجہ سے ایک طرف حکمرانوں کا احتساب ممکن نہیں ہوتا تھا، موروثی نظام کی وجہ سے انھیں اقتدار سے بے دخلی کا ڈر نہیں رہتا تھا جس کی وجہ سے وہ زندگی کی لذتوں، آسانیوں اور رنگینیوں کی کشش میں مبتلا ہو جاتے تھے، دوسری طرف عوام کی امور مملکت سے لاتعلقی کے نتیجے میں ان کی اپنے ملک سے محبت، جذبۂ قربانی اور ملکی قانون کی پابندی میں کمی آنے لگتی تھی۔ نتیجہ کسی اور طاقت کے غلبے یا ظہور کی شکل میں نمودار ہوتا تھا۔

زمانۂ قریب میں کمیونسٹ روس کا خاتمہ بھی جمہوریت کے فقدان سے ہوا۔ شروع میں کمیونزم کے نظریاتی جذبے اور کشش کی وجہ سے ملک ترقی کرتا رہا۔ مگر بعد میں جب کمیونسٹ پارٹی کی ایک اعلیٰ ترین کلاس کے ہاتھ میں سارا اختیار مرتکز ہو گیا، احتساب ختم ہو گیا، میرٹ کی جگہ رشوت نے لے لی، بالادست طبقے سے امانت و دیانت ختم ہو کر رہ گئی تو عوام نے محنت چھوڑ دی۔ ان کی اپنے ملک سے محبت نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ سوسائٹی پوری طرح کرپٹ ہو کر رہ گئی۔ نتیجتاً وہ اندر سے اتنی کھوکھلی ہو گئی کہ وہ افغانستان کے چھوٹے سے دھچکے سے بھی سنبھل نہ سکی۔ اگر اس وقت افغانستان کے مسئلے کے بجائے کوئی بھی اور مسئلہ سوویت یونین کے لیے پیدا ہو جاتا تو یہی نتیجہ برآمد ہونا تھا۔ اگر افغانستان میں روسی مداخلت کا موازنہ ویت نام میں امریکی مداخلت سے کیا جائے تو ویت نام میں امریکی جانی و مالی نقصان روس کے افغانستان میں نقصان سے کئی گنا زیادہ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تھا۔اس کے باوجود امریکہ پر ویت نام کی لڑائی کا کوئی بڑا اثر مرتب نہیں ہوا۔

جمہوریت کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اگر کوئی جمہوری ملک کچھ اور عوامل کے نتیجے میں سپر پاور کے درجے سے گر جائے ،تب بھی وہ مکمل طور پر زوال آشنا نہیں ہو جاتا ، بلکہ وہ اپنے آپ کو سنبھال لیتا ہے ۔مثلاً دوسری جنگ عظیم میں جرمنی، جاپان اور اٹلی ایک عظیم نقصان اور شکست سے دوچار ہو گئے ۔دوسری طرف برطانیہ اور فرانس کا نقصان بھی کچھ کم نہ تھا۔لیکن یہ تمام آج بھی بہت بڑی طاقتیں ہیں ۔ان میں سے ہر ایک ملک کی علیحدہ علیحدہ مجموعی قومی پیداوار تمام عالم اسلام کی مجموعی پیداوار سے زیادہ ہے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی

سپر پاور بننے اور برقرار رہنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی پر اعلیٰ ترین دسترس حاصل کی جائے اور اس معیار کو نمو و ترقی کے ذریعے سے برقرار رکھا جائے ۔ یہ ترقی صنعتی ،زرعی ،طبی ،دفاعی ،جنگی غرض یہ کہ ہر میدان میں ہونی چاہیے۔گویا جدید ترین علم کا مسلسل حصول اور اس کا استعمال واطلاق ایک سپر پاور کے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ظاہر ہے کہ اس غرض کے لیے تعلیم ،ریسرچ ،دریافت اور اس سے متعلقہ تمام پہلوؤں کی طرف آخری درجے میں بھرپور توجہ ضروری ہے۔چنانچہ سپر پاورز یہ سب کام کرتی ہیں اور یہ ان کے لیے اہم ترین شعبوں میں سے ایک ہوتا ہے۔

ٹیکنالوجی کی برتری کی وجہ سے انگریزوں ،فرانسیسیوں ،پرتگیزوں اور ولندیزوں نے سترہویں اور اٹھارویں صدی میں مسلم دنیا سمیت افریقہ اور ایشیا کے بہت بڑے علاقوں پر قبضہ جما لیا جو انیسویں صدی کے نصف تک جاری رہا۔اسی فرق کی وجہ سے ٹیپو سلطان اور سراج الدولہ شکست کھا گئے ۔بہتر ٹیکنالوجی اور تنظیم ہی کی وجہ سے سید احمد شہید کے مقابلے میں سکھ غالب رہے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حریت پسندوں کے مقابلے میں انگریز کامیاب رہے۔

ٹیکنالوجی ہی کی مدد سے امریکہ نے روس کو افغانستان میں ۱۹۸۵ء میں شکست دی جب اسٹنگر میزائلوں نے روسی ہیلی کاپٹروں پر ۹۰ فی صد ٹھیک نشانے لگا کر ان کی فضائی برتری ختم کر دی۔اسی وجہ سے برطانیہ نے ارجنٹائن کے بالکل پاس جا کر فاک لینڈ کی جنگ میں اسے شکست سے دوچار کیا۔ یہ ٹیکنالوجی ہی کا کرشمہ تھا کہ امریکہ نے اپنے کسی خاص جانی نقصان کے بغیر طالبان کو شکست سے دوچار کیا۔

یہاں ایک سوال کا جواب مناسب معلوم ہوتا ہے ۔وہ یہ کہ مسلمانوں کے دور زوال کی تاریخ غداروں سے کیوں بھری ہے؟ کہا جاتا ہے کہ میر جعفر کی غداری سے سراج الدولہ اور میر صادق کی غداری سے ٹیپو سلطان شکست کھا گئے ۔ ۱۸۵۷ء کی شکست بھی اپنوں کی غداری ہی کا نتیجہ تھی اور سید احمد بھی چند خوانین کی غداری کی وجہ سے بالاکوٹ کے میدان میں شہید ہو گئے ۔ یہ دراصل سطحی تاریخی اور عمرانی مطالعے کا نتیجہ ہے ۔دراصل غدار ہمیشہ اس جگہ جنم لیتے ہیں جب ایک طرف کی فوج ٹیکنالوجی اور معروضی حالات کی وجہ سے واضح برتر پوزیشن میں ہو اور دوسری طرف کے کچھ ذمہ دار لوگوں کی اپنے تجزیے کی

www.javedahmadghamidi.org

وجہ سے شکست سامنے نظر آ رہی ہو تو وہ اپنے ذاتی اور گروہی مفادات کو محفوظ کرنے کے لیے دشمن سے اپنا معاملہ طے کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان تمام لڑائیوں میں انگریزوں کے ہاں کسی غدار نے جنم نہیں لیا۔ اس قابل شرم مخلوق نے ہمیشہ ہماری طرف ہی سے جنم لیا ہے۔

گویا جو بھی طاقت اپنے آپ کو برتری کے مقام پر فائز دیکھنا چاہتی ہو، اس کے لیے لازم ہے کہ وہ سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی کے میدان میں اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہو۔

قدرتی عوامل اور ارتقائے زمانہ

کئی قدرتی عوامل اور زمانے کی ترقی بھی مختلف طاقتوں کی برتری و کمزوری میں اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ جس ملک کی آبادی زیادہ ہو، رقبہ بڑا ہو اور وہ قدرتی وسائل پر دسترس رکھتا ہو، اتنا ہی اس کے سپر پاور بننے کا امکان زیادہ ہو جاتا ہے اور اگر وہ اس مقام پر نہ رہے تب بھی وہ کامل زوال اور فنا سے بچ جاتا ہے۔ اسی طرح زمانے کی ترقی سے ایسے نئے عوامل پیدا ہوتے ہیں جن سے معروضی حالات میں جوہری فرق رونما ہو جاتا ہے۔ مثلاً چین کے ایک بڑی طاقت بننے میں اس کی آبادی اور رقبے کا بڑا دخل ہے۔ امریکہ کا معاملہ بھی ایسا ہے۔ اسی طرح سوویت یونین دنیا کے نقشے سے مٹ گیا، مگر روس پھر ایک بڑی طاقت کے طور پر ابھر رہا ہے اور ممکن ہے کہ اگلے پانچ دس سال میں اس کی عظمت رفتہ کسی حد تک پھر بحال ہو جائے۔

اسی طرح جب جمہوریت دنیا کے اندر ایک مسلمہ قدر بن گئی تو مغربی ممالک کے اندر یہ عوامی شعور ابھرا کہ دوسری قوموں کو غلام بنانا غلط ہے۔ دوسری طرف ان غلام قوموں کے اندر بھی یہ احساس پیدا ہوا کہ اگر جمہوریت مغرب کے لیے اچھی ہے تو وہ ہمارے لیے کیوں بری ہے۔ اس کے نتیجے میں یہ ممالک آزاد ہو گئے۔

مغرب کے اندر یہ اقدار اب مسلمہ حیثیت اختیار کر گئی ہیں۔ اب وہاں کی حکومتیں دوسرے ممالک سے معاملات کرتے وقت بظاہر ان کی خلاف ورزی نہیں کرتیں، اس لیے کہ ان کو اپنے ہاں کے عوامی ردعمل کا ڈر ہوتا ہے۔ گویا اگر کوئی عام ملک مغربی ممالک کی دست برد سے محفوظ رہنا چاہے تو خود انھی کی اقدار سے فائدہ اٹھا کر ایسا کر سکتا ہے۔ اب یہ بھی مغرب کی مجبوری بن گئی ہے کہ کسی بھی دشمن پر حملے سے پہلے اس کے لیے اپنی رائے عامہ کو مطمئن کرنا، بلکہ بسا اوقات دنیا کے ایک بڑے حصے کو مطمئن کرنا، بلکہ عملاً اپنے ساتھ ملانا لازم بن جاتا ہے۔

اب کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی ایجاد نے ترقی پزیر دنیا کے سامنے ٹیکنالوجی کے حصول کے آسان ترین راستے کھول دیے ہیں۔ اب سائنس اور ٹیکنالوجی پر کسی کی اجارہ داری نہیں رہی۔ ہر ملک عزم صمیم اور پیہم محنت کے ذریعے سے کم سے کم وقت میں سائنس کی اعلیٰ ترین رفعتوں کو پا سکتا ہے۔ گویا ٹیکنالوجی کے حصول میں وقت کا فرق (time gap) ختم ہو گیا ہے اور غیر ترقی یافتہ ممالک بہت کم عرصے میں مغرب کے برابر ٹیکنالوجی پر عبور حاصل کر کے اس خلیج کو پاٹ سکتے ہیں۔

ایسے ہی عوامل کی وجہ سے قدرت کمزور قوموں کو زندہ رہنے اور آگے بڑھنے اور مضبوط ملکوں کو مضبوط تر بننے کے مواقع دیتی

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.org

رہتی ہے۔ اب کوئی تو ان مواقع سے فائدہ اٹھالیتا ہے اور کوئی اپنے آپ کو محروم رکھ لیتا ہے۔

صحیح حکمت عملی

سپر پاور بننے، رہنے اور اپنے آپ کو حال اور مستقبل کی مشکلات سے بچانے کی خاطر عالمی حالات کا صحیح تجزیہ اور اس کے مطابق عمل کرنا بھی حد درجہ ضروری ہے۔ یہ حکمت عملی زمانۂ امن اور زمانۂ جنگ، دونوں میں ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لیے جاسوسی کا ایک وسیع نیٹ ورک تشکیل دیا جاتا ہے۔ مخالف قوت کے خلاف چالیں چلی جاتی ہیں اور اس کی چالوں کو ناکام بنایا جاتا ہے۔ یہاں اس ضمن میں اصل اہمیت کسی اخلاقی اصول کی نہیں، بلکہ اپنے ملک کی کامیابی کی ہوتی ہے۔ مثلاً اپنے ملک میں رشوت دینے کا تصور بھی نہیں کیا جاتا، مگر باہر کے مخالفین کو خریدنے کے لیے رقم کا استعمال بے تکلف کرلیا جاتا ہے۔ گویا سپر پاور کے لیے دوسرے ملکوں سے تعلق رکھنے کے ضمن میں سب سے بڑا اصول دراصل ہر اس ممکن طریق عمل سے کام لینا ہے جس سے وہ سپر پاور کے منصب پر سرفراز رہے یا اگر مجبوری آڑے آجائے تو وہ ایک خاص سطح سے گرنے نہ پائے۔ جمہوری ممالک میں تمام غیر سرکاری ادارے بھی ہر اہم اور بحرانی موقع پر اپنے ملک کی بھرپور مدد کرتے ہیں۔ مثلاً سرد جنگ کے زمانے میں سارا مغربی میڈیا کمیونزم کے خلاف پروپیگنڈے میں اپنی حکومتوں کا ہم نوا تھا۔ افغانستان میں روسی فوجی مداخلت کے بعد آزاد مغربی میڈیا پاکستان کے فوجی حکمران جنرل ضیاء الحق کے لیے پوری طرح رطب اللسان تھا اور انھیں اس ملک میں جمہوریت کی یاد قطعاً نہ ستائی۔ نائن الیون کے واقعے کے بعد امریکی ٹی وی اور پریس میں کوئی مخالفانہ رائے دینا ناممکن حد تک مشکل تھا۔ گویا جس ''قومی مفاد'' پر ''اجماع'' ہو جائے، وہاں قومی مفاد ہی اعلیٰ ترین اصول بن جاتا ہے۔

ہر جنگ اور ہر معرکے میں اسی ملک کو کامیابی ملی ہے جس نے بہتر حکمت عملی کا مظاہرہ کیا۔ اگر جرمنی جذباتیت سے کام لے کر پہلی اور دوسری جنگ عظیم نہ چھیڑتا تو آج وہ سپر پاور ہوتا۔ یہی صورت حال جاپان کی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب برطانیہ نے دیکھا کہ اس کی آبادی تھوڑی ہے اور اب اس کے لیے اپنی نوآبادیات کو قابو میں رکھنا ممکن نہیں ہے تو اس نے آہستہ آہستہ تمام غلام ملکوں کو آزاد کر کے اپنی قوت محفوظ کرلی۔ ہمارے ہاں بعض کم فہم سیاسی نعرے بازی کے طور پر کہتے ہیں کہ برطانیہ عظمیٰ پر پہلے سورج غروب نہیں ہوتا تھا، اب اس پر سورج طلوع بھی نہیں ہوتا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سورج نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا سے طلوع ہوتا ہے جو سلطنت برطانیہ ہی کی ایک توسیع ہے اور پھر وہ بحر ہند کے انگریزی عمل داری والے مختلف جزیروں سے ہوتا ہوا جنوبی افریقہ جا پہنچتا ہے۔ یہاں سورج یورپ سے ہوتا ہوا امریکہ جا پہنچتا ہے جو برطانیہ ہی کی اولاد ہے اور وہاں سے ہوتا ہوا وہ بحرالکاہل کے ان جزیروں پر جا چمکتا ہے جہاں امریکی پرچم لہراتا ہے۔

چین نے بھی خارجہ حکمت عملی کے میدان میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ تائیوان اسی کا جزو ہے جو امریکی پشت پناہی سے آزاد ملک کی حیثیت سے زندہ ہے، مگر چین نے آج تک اس کے خلاف کوئی فوجی کارروائی نہیں کی، اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ اس سے وہ مشکلات میں پھنس جائے گا۔ اسی طرح ایک لمبے عرصے سے اس نے یہ پالیسی بنائی ہے کہ وہ کسی بین الاقوامی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

معاملے میں براہ راست مداخلت نہیں کرے گا۔ چنانچہ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں اس نے پاکستان کی کوئی فوجی مدد نہیں کی، حالانکہ اس کی عملی مداخلت کی صرف دھمکی ہی بنگلہ دیش بننے میں بڑی رکاوٹ ثابت ہوسکتی تھی۔ اسی طرح ۱۹۸۴ء میں سیاچین پر بھارتی قبضے کے وقت بھی اس نے کوئی سرگرمی نہیں دکھائی۔ ۱۹۹۹ء میں پاکستان نے کارگل کے محاذ پر جولڑائی شروع کی، اس پر بھی چین نے ناراضی کا اظہار کیا اور پاکستان کی عملی مدد سے انکار کیا۔ دراصل چین کی حکمت عملی یہ ہے کہ ایک بھرپور عالمی طاقت بننے تک وہ امریکہ سے کسی بھی طرح بگاڑ پیدا نہ کرے تاکہ امریکہ کو اس کے خلاف کارروائی کا کوئی جواز نہ مل سکے۔

اسی طرح جب چین نے دیکھا کہ کمیونزم اس کی معاشی ترقی میں رکاوٹ بن رہا ہے تو اس نے بہت عرصہ پہلے بڑے شہروں میں سرمایہ دارانہ نظام کو پھلنے پھولنے کی آزادی دی۔ اسی لیے جب روس اور باقی کمیونسٹ دنیا میں بغاوت کی لہر پورے زوروں پر تھی، چین اس سے نسبتاً محفوظ تھا۔ کمیونسٹ پارٹی نے اقتدار پر سے تو اپنی گرفت کمزور نہیں کی، لیکن عوام کو مزید معاشی آزادی دے کر اس نے اپنے ہاں بغاوت پر قابو پالیا۔ اور اب نومبر ۲۰۰۲ میں بوڑھی قیادت نے نئی قیادت کے لیے جگہ چھوڑ کر ایک بڑا کارنامہ سرانجام دے دیا ہے۔

سپر پاورز دنیا میں اپنی سودے بازی کی قوت برقرار رکھنے کی خاطر اپنے سخت ترین مخالف ملکوں کو بھی قرضے اور امداد دیتی ہیں۔ مثلاً امریکہ غیر ترقی یافتہ دنیا کے تمام ممالک کو امداد دیتا ہے جس میں اس کے بدترین مخالف بھی شامل ہیں۔ اس سے امریکہ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ رابطے کا دروازہ کھلا رہے اور مناسب موقع پر اسے استعمال کیا جائے۔ سپر پاورز اپنی غلطیوں سے بھی بہت کچھ سیکھتی ہیں۔ اپنی پوری تاریخ میں امریکہ سے ایک ہی بڑی غلطی ہوئی ہے اور وہ ہے ویت نام میں فوجی مداخلت۔ اس کے مقابلے میں امریکہ نے بہت سی کامیابیاں حاصل کی ہیں، تاہم امریکہ میں ان کامیابیوں کو بہت کم یاد رکھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس واشنگٹن کی اہم ترین یادگاروں میں سے ایک ویت نام جنگ کی یادگار ہے۔ اس عجیب وغریب یادگار، جس پر ان تمام اڑسٹھ ہزار ہلاک شدگان کے نام بمعہ کمپنی ورجمنٹ کندہ ہیں جو اس جنگ میں کام آئے، روزانہ سیکڑوں افراد آتے ہیں اور میموریل ڈے پر تو وہاں ہزاروں ہزاروں افراد کے میلے کا سماں رہتا ہے۔ یہ عام انسانی نفسیات ہے کہ لوگ اپنی ناکامیاں فراموش کرنے کو ترجیح دیتے ہیں جیسے ہم نے بحیثیت قوم سقوط مشرقی پاکستان کی یاد کبھی نہیں منائی اور چھ ستمبر کی چھٹی ہمیشہ کرتے ہیں۔ اسی طرح پچھلے ایک برس کے دوران میں طالبان کی حامی قوتوں نے طالبان کی شکست کا کوئی سنجیدہ تجزیہ نہیں کیا، بلکہ ان کی تقریروں سے طالبان کا نام ہی غائب ہوگیا ہے۔ لیکن زندہ قومیں اپنی کامیابیوں کے بجائے ناکامیوں کو ایک زندہ واقعے کے طور پر یاد رکھتی ہیں اور ہر ہر حوالے اور پہلو سے ان کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ تاکہ آیندہ اس کے اعادے سے بچا جا سکے۔

یہ بات واضح ہے کہ سپر پاورز خارجہ تعلقات اور اقدامات کے ضمن میں خفیہ اور کبھی کبھار علانیہ طور پر دہرے معیار سے کام لیتی ہیں، تاہم وہ بظاہر اور بعض اوقات مجبوراً بین الاقوامی معاہدوں کا احترام کرتی ہیں۔ جمہوری ممالک کے خلاف قدم اٹھانا

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ان کے لیے ناممکن حد تک مشکل ہوتا ہے اور اب اپنی رائے عامہ کو مطمئن کرنا، اپنے اقدامات انسانی امن اور انسانیت کے مفاد کے لیے ثابت کرنا اور اقوام عالم کی اکثریت کو کسی بھی طریقے سے مطمئن کرنا، ان کے لیے کسی بھی بڑی مہم سے پہلے لازم بن گیا ہے۔ یہ سب کچھ حکمت عملی کے ایک حصے کے طور پر کیا جاتا ہے۔

امریکہ بحیثیت سپر پاور برقرار رہنے کے تقاضے

درجہ بالا بحث سے یہ حقیقت ظاہر ہے کہ امریکہ سپر پاور برقرار رہنے کے تمام تقاضے بدرجۂ اتم پورا کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے تمام بین الاقوامی تنازعات میں سرگرم شمولیت اور وابستگی سے اپنے آپ کو اقوام عالم کے لیے ناگزیر بنا دیا ہے۔ اس نے اپنے لیے ضروری خام مال کی فراہمی کا سامان بھی کر لیا ہے۔ تیل پیدا کرنے والے تمام ممالک اس کے اشارۂ ابرو کے محتاج ہیں۔ اس کے اپنے تیل کے ذخیرے محفوظ ہیں اور اگلے پندرہ بیس برس کے اندر ایسی ٹیکنالوجی بالکل عام ہو جائے گی جب تیل کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔ گویا اگلی ربع صدی سے لے کے تیس چالیس برس کے اندر تیل پیدا کرنے والے ممالک کا موجودہ سنہرا دور ختم ہو جائے گا۔

کیا امریکہ سپر پاور کے مرتبے سے گر سکتا ہے

اگر امریکہ کے اندر اجتماعی اخلاقیات میں کمزوری آجائے، جمہوری اقدار ماند پڑ جائیں، انصاف کی حکمرانی نہ رہے، سائنس اور ٹیکنالوجی میں کوئی دوسرا ملک اس سے آگے بڑھ جائے، اگر اس سے بین الاقوامی تنازعات میں کوئی غلطی سرزد ہو جائے اور اگر وہ یہ بھول جائے کہ اسے سپر پاور برقرار رہنے کے لیے ہر وقت بہترین حکمت عملی پر کاربند رہنا ہے تو یقیناً وہ اس مقام کا مستحق نہیں رہے گا۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org